فہرست مضامین

تعارف	۱
دل کی صلاحیتوں کی بیداری کی ضرورت	۵
اللہ کی محبت خصوصیات وعلامتیں امام غزالی کی نظر میں	۱۱
روح اور روحانی تقاضے	۱۹
فرد کی تعمیر وبگاڑ اور نشو ونما میں عادتوں کا کردار	۲۳
تکبر اور دعویٰ کی نفسیات اوراس کی اصلاح کی راہ میں حائل دشواریاں	۳۲
بندہ مؤمن کے لئے دستور العمل عہد جدید کے پس منظر میں	۳۹

تعارف

مغرب کی جلائی ہوئی آگ

اوراس سے نکلنے کی صورت

زیر نظر کتاب ہفتہ وار اصلاحی وتربیتی نشستوں میں ہونے والی گفتگو یا تحریری صورت میں پڑھی جانے والی معلومات پر مشتمل ہے۔

یہ تحریر دراصل راہ سلوک میں چلنے والے افراد کی کیفیات، حالات ان کے مدوجزر، اشکالات اور محبت ومعرفت کے سفر میں درپیش مشکلات، ان سے عہدہ برآ ہونے کی صورت، تہذیب نفس اور نفس مطمئنہ کی راہ میں نفس، شیطان وماحول کی طرف سے پیش ہونے والی رکاوٹوں اور طالبوں کے حوصلہ کو مہمیز دینے، معاشرہ میں بڑھتے ہوئے فساد اور اس کی نوعیت کو سمجھنے کے نقطہ نگاہ سے لکھی گئی ہے۔

''بندہ مؤمن کا دستور العمل'' کے عنوان سے تفصیلی مضمون میں راہ محبت میں چلنے والے افراد کے لئے روزمرہ زندگی کا لائحہ عمل متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کتاب کا سب سے تفصیلی مضمون ہے، اس کے ابتدائی نکات مختصر ہیں۔ بعد میں پیش ہونے والے نکات تفصیلی ہیں، جنہیں ابتدائی پچاس ساٹھ نکات کی توضیح سمجھنا چاہئے۔

ہمارا معاشرہ اس وقت جس بڑے بحران سے دوچار ہے اور یہ بحران سنگین سے سنگین تر ہوتا جارہا ہے، وہ بحران یہ ہے کہ انسانی شخصیت میں موجود اصل جوہری قوتوں روح اور دل کی پاکیزگی کا ادراک سلب ہوتا جارہا ہے۔ چونکہ سیرت وکردار میں پاکیزگی، فہم وفراست، تدبر وحکمت، انسانیت نوازی، صبر وقوت برداشت، دنیا سے استغنا، اور اللہ کے نور سے دیکھنے کی استعداد وغیرہ ان ساری صفات کا تعلق دل وروح کی لطافتوں اوران کی بالیدگی سے ہے۔ اوراس چیز کا ادراک نہ ہونے کی وجہ سے ہمارا معاشرہ مغربی معاشرہ

کی طرح سیرت وکردار کے بحران، سنگ دلی، قساوت قلبی، باطنی بینائی سے محرومی اور مادیت پرستی کی راہ پر گامزن ہے۔

زیرنظر کتاب میں ذیلی طور پر یہ بحث بھی کی گئی ہے کہ مغرب نے اپنے اجتماعی نظام کی تشکیل میں خدا سے انکار یا اس سے بے نیازی کی جو راہ اختیار کی ہے، مغرب کے اس تعلیمی وتربیتی واجتماعی نظام کو اختیار کرکے، ہم بھی اسی طرح کے انسان تیار کرکے، تیزی سے تباہی کی راہ پر گامزن ہیں۔ اس صورتحال کو بدلنا چاہئے اور دل وروح کی لطافتوں اور ان کے تقاضوں کو سمجھکر، اپنے نظام تعلیم وتربیت میں ان کی تسکین وتشفی کا انتظام ہونا چاہئے، تاکہ معاشرہ کو مادیت پر فدا ہونے والے انسان تیار کرنے کی بجائے انسانوں کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھنے اور فہم وفراست، تدبر وبصیرت کے حامل انسان فراہم ہوسکیں، یہ کام دل وروح کی صلاحیتوں کی بیداری اور تہذیب نفس کے لئے جامع پروگرام مرتب کئے بغیر ممکن نہیں۔

زیرنظر کتاب میں اگرچہ اپنی اور ساتھیوں کی اصلاح اور تہذیب نفس اور اللہ کی محبت کی راہ میں حائل دشواریوں جیسے مسائل پر گفتگو شامل ہے۔

لیکن اوپر جس اہم اور بنیادی نکتہ کی نشاندہی کی گئی ہے، کتاب میں اس طرف بھی بھرپور توجہ دلائی گئی ہے۔ اگر ہم اپنے معاشرہ کو مکمل طور پر دل کے اندھوں کے معاشرہ میں تبدیل کرنا نہیں چاہتے تو ہمیں بیدار ہونا پڑے گا اور مغرب کے مادہ پرست انسان کے فکر وفلسفہ کو اپنے نظام تعلیم وتربیت کا حصہ بنانے کی روش پر نظر ثانی کرنا ہوگی۔

اس روش کے نتیجہ میں ہم معاشرہ کے بیشتر ذہین وباصلاحیت طبقات کو مادہ پرست مغربی طرز فکر، مغربی فلسفہ حیات اور زندگی کے مسائل کے فہم کے بارے میں مغربی نقطہ نگاہ کا حامل بنا چکے ہیں، اس طرح ہم انہیں بالواسطہ طور پر مادہ پرست مغرب کے حوالے کر چکے ہیں۔ ان افراد کو دل کے بے پناہ صلاحیتوں کے حوالے سے حقائق سمجھانا اور اپنے پاکیزہ علوم پر ان کے اعتماد کو بحال کرنا دشوار تر کام ہے۔ اب ہمیں آئندہ نسلوں کی فکر کرنی

چاہے۔

اللہ کی راہ محبت، دل وروح کی صلاحیتوں کی بیداری کی راہ ہے۔ مادی کثافتوں سے صفائی وپاکیزگی کی راہ ہے، فہم وفراست اور حکمت وتدبر کی صلاحیتوں سے بہرہ وری کی راہ ہے، اللہ کے ساتھ ساتھ انسانوں کی محبت کی راہ ہے اور انسانوں کے درد وغم میں گھلنے کی راہ ہے۔

کتاب میں اس موضوع پر سیر حاصل گفتگو کرکے، اس راہ پر چلنے کے لئے اکسانے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔

مغرب جو لگ بھگ تین سو سال سے خدا سے انکار یا اس سے بے نیازی کی راہ پر گامزن ہوکر، اپنے سارے علوم وفنون اور سارے اجتماعی نظام کو اسی بنیاد پر تشکیل دے چکا ہے، وہ انسانی زندگی پر پڑنے والے انکار خدا کے ہولناک نتائج دیکھکر اب اس خلا کو پُر کرنے کے لئے مصنوعی خداؤں کو تراشنے کی راہ پر گامزن ہے، تاکہ انسانی زندگی کو لاحق مادہ پرستی کے طوفانوں سے بچاکر، اسے کسی حد تک پُرسکون بنایا جا سکے، مغربی فلاسفر ودانشور شب وروز اس کوشش میں مصروف ہیں۔

اس سلسلہ میں مادی نوعیت کے مراقبوں کی مشقیں، داخلی توانائی کے حصول کی کوششیں، عقل کی بجائے دل کو توانائی، روشنی اور علوم کا مرکز سمجھنے کی تحقیقیں وغیرہ یہ سب اسی کوشش کا حصہ ہے، لیکن تین سو سال سے اجتماعی زندگی سے خدا کے عقیدہ کو نکالنے کے معاملہ میں مغرب جتنا آگے بڑھ چکا ہے، اس کے لاکھوں دانشوروں نے ان موضوعات پر لٹریچر کا جو بہت بڑا ذخیرہ تیار کرلیا ہے اور مغربی سرمایہ دار، دولت کی ہوس میں اندھا ہوکر، وہ جس طرح مادیت اور نفسی قوتوں کو مشتعل کرنے کے لئے اپنی قوتیں اور وسائل صرف کر چکا ہے، اسے دیکھتے ہوئے مصنوعی خداؤں کے ذریعہ سکون کی راہ کی ان کی کوششیں نتیجہ خیز ثابت ہوسکیں، ناممکن ہے۔

البتہ مغرب کی اس تحقیق سے مغربی فکر سے مرعوب ہمارے ذہین افراد میں مغرب کے تراشے ہوئے ان نئے خداؤں میں دلچسپی کا رجحان بڑھنے لگا ہے۔ چونکہ وہ ہمارے

اپنے علوم سے بے گانہ ہو چکے ہیں، اس لئے مغرب کی ہر نئی تحقیق ان کی آنکھوں کو چکا چوند کرنے کا باعث بن رہی ہے۔

بدقسمتی سے مغرب نے مادہ پرستی کی جو آگ جلائی ہے، اس میں وہ خود بھی جل رہا ہے تو دنیا بھر کے ذہین و باصلاحیت افراد کو بھی بلکہ لگ بھگ پوری انسانیت کو اس آگ میں جلانے کا ذریعہ بن گیا ہے۔

مسلم امت کے پاس وہ حقیقی رہنمائی موجود ہے، جس سے وہ خود بھی اس بحران سے نکل سکتی ہے تو مغرب (جو اس اعتبار سے قابل رحم حالت تک پہنچ چکا ہے، اور وہ انسانی شفقت ورحمت کے جذبات سے بُری طرح عاری ہو چکا ہے) اس کی رہنمائی بھی کر سکتا ہے، اس کے لئے دل و روح کی صلاحیتوں کی بیداری کے ساتھ اسلام کی انسانیت نواز اور ہمہ جہتی تعلیمات کو بھی اختیار کرنا پڑے گا، جو قرآن وسنت کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔ **(آمین)**

۱۷ستمبر۲۰۱۵ء **محمد موسیٰ بھٹو**

دل کی صلاحیتوں کی بیداری کی ضرورت

موجودہ دور میں ہمارے ساتھ جو بڑا المیہ ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ ہمارے جدید تعلیمی اداروں اور دینی درسگاہوں سے دل کی دنیا اور دل کی سلامتی کی راہ کا ادراک سلب ہو گیا ہے، خال خال افراد ہوں گے، جو دل کی اصلاح اور اس کی سلامتی کے کام کو فیصلہ کن اہمیت دے کر، اس راہ پر گامزن ہوتے ہوں، ورنہ عام طور پر مادی علوم وفنون اور ظاہری دینی علوم میں ساری توانائیاں صرف ہو رہی ہیں۔ دل کے مسائل، محبوب حقیقی کے لئے دل کی بے پناہ تڑپ، دل کی اصل ضرورت اور پیاس، اس پیاس کے بجھانے کی صورت، سلامتیٔ دل کے لئے کاوشیں، دل کو نفس اور عقل کی یرغمالی سے بچانے کی سعی، دل کے ذریعہ روح کو لطیف سے لطیف تر بنانے کی جدوجہد، یہ ساری باتیں اب زیادہ تر ماضی کی داستان بن کر رہ گئی ہیں یا کتابوں کی زینت بن گئی ہیں۔

جدید تعلیمی ادارے اگر دل کی سلامتی کی بربادی کی کاوشوں میں مصروف ہیں تو سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ ان اداروں کی بنیاد اور ان کے نصاب کی تشکیل میں جدید مادہ پرست اور عیار مغربی انسان کی کاوشوں کو عمل دخل ہے، ہماری تعلیمی پالیسیاں عملی طور پر عالمی ساہوکار کے ہاتھوں میں چلی گئی ہیں، انہوں نے پیسوں کے ذریعہ ہمارے پالیسی ساز عناصر کو خرید لیا ہے اور وہ رفتہ رفتہ ہمارے سارے تعلیمی نظام کو خالص سیکولرازم کی بنیاد پر تشکیل دے رہے ہیں۔

جدید تعلیمی ادارے اگر مادہ پرست، نفس پرست اور دل کی حقیقی صلاحیتوں سے قاصر انسان تیار کرنے کا ذریعہ بن گئے ہیں تو سمجھ میں آنے والی بات ہے، لیکن دینی درسگاہوں سے فارغ ہونے والے افراد کی بڑی اکثریت کا دین کے ظاہری علوم سے آگے بڑھکر دل کی صلاحیتوں اور اس کے تقاضوں سے ناآشنا ہونا اور سلامتیٔ دل کی کاوشوں سے بے نیاز ہونا،

بڑی تشویش کی بات ہے، اس لئے کہ دینی علوم پر عمل پیرا ہونے کی صلاحیت، اخلاق حسنہ اور انسانی جوہروں سے بہرہ وری کا سارا تعلق دل کی بیداری اور محبوب حقیقی کے لئے اس کے والہانہ جذبات محبت کو صحیح رخ دینے سے وابستہ ہے۔ اگر دینی مدارس سے یہی بنیادی کام نہ ہو تو گویا دینی مدارس ایک طرح سے روح سے خالی افراد تیار کرنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

ہمارا ماضی اور سلف صالحین کی تاریخ شاہد ہے کہ دین کے ظاہری علوم کے ساتھ ساتھ ان کا زور دل کے ذریعہ معرفت نفس اور معرفت رب کی صلاحیتوں کی بیداری اور قلب کو، قلب سلیم بنانے کی کاوشوں پر صرف ہوتا تھا۔

موجودہ دور میں اس کام کی اہمیت پہلے سے کئی گنا زیادہ ہوگئی ہے، اس لئے کہ اب مادہ پرستی اور نفس پرستی کی قوتیں ہولناک صورت اختیار کر چکی ہیں اور مادی حسن پر فدائیت کی ادائیں عروج پر ہیں۔ نفس کو ہر وقت مشتعل کر کے، فرد وافراد کو شیطنت کی راہ پر گامزن کرنے کے لئے طاقتور سے طاقتور اور تیز تر آلات وجود میں آ گئے ہیں۔ اس دور میں ہر وقت ایمان کی سلامتی کو خطرات لاحق ہیں۔ ایسے حالات میں اگر دل کی خفتہ صلاحیتیں بیدار نہ ہوں اور محبوب حقیقی کے ساتھ محبت کے قابل قدر اجزاء موجود نہ ہوں تو عالمی سطح سے اٹھنے والے مادہ پرستی اور نفس پرستی کے سیلاب میں بہنے سے بچنے کی صورتیں مسدود ہو جاتی ہیں۔

حقیقت میں اس دور کا تقاضا یہ ہے کہ جتنی اہمیت ظاہری دینی علوم کو حاصل ہونی چاہئے، اس سے زیادہ اہمیت دل کی خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے اور سلامتیٔ دل کے مراحل طے کرنے اور محبوب حقیقی کے ساتھ دل کے رشتہ کو مستحکم کرنے کے کام کو دینی چاہئے، تاکہ دینی مدارس سے فارغ ہونے والے علماء کرام اخلاص، للھیت، بے نفسی اور بے غرضی جیسی صفات سے بہرہ ور ہو کر، معاشرہ کی تعمیر کے سلسلہ میں مؤثر کردار ادا کر سکیں۔

(۲)

مغرب کے عیار انسان نے انسانیت کے ساتھ سب سے بڑی دشمنی جو کی ہے، وہ یہ ہے کہ سیکولرازم اور عقلیت کے نام پر ایسا نظام تشکیل دیا ہے اور عسکری قوت، دولت اور طاقتور

میڈیا کے ذریعہ اسے پوری انسانیت پر مسلط کرنے کی کوشش کی ہے، جس نظام میں خدا، مذہب، وحی، رسالت اور عقیدہ آخرت کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے اور اس اجتماعی نظام کی بنیاد انسان کے ترقی یافتہ حیوان اور دنیا سے زیادہ سے زیادہ لذتیاب ہونے اور مادی زندگی ہی اصل اور آخری زندگی ہے کے نظریات پر مبنی ہے۔

مغرب کا مادہ پرست انسان جس کی قیادت عالمی ساہوکار کے ہاتھ میں ہے، اس عالمی ساہوکار نے اپنے عمل سے دنیا پر یہ بات واضح کردی ہے کہ سارے ممالک اور دنیا کی ساری قوموں کو اپنی اجتماعی زندگی میں مغرب کے ان مادی نظریات اور ان کے اصولوں کو رائج اور نافذ کرنا ہوگا۔ دوسری صورت میں ان پر خوفناک جنگ مسلط کردی جائے گی۔

مغرب کی طرف سے آنے والا یہ چیلنج ایسا ہے، جو دنیا کی دوسری قوموں کے لئے شاید چیلنج کی حیثیت نہ رکھتا ہو، اس لئے کہ دوسروی قومیں مذہب اور پاکیزہ اخلاقی نصب العین کے بارے میں نہ تو کوئی واضح پروگرام رکھتی ہیں اور نہ ہی ان کے بارے میں حساس ہیں، لیکن مسلم امت کے لئے مغرب کا یہ چیلنج ان کی زندگی اور موت کے سوال کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کی مؤثر صورت یہی ہے کہ ہمارے تعلیمی وتربیتی ادارے دل کی ان صلاحیتوں کو بیدار کرنے اور سلامتی، دل کے ارتقائی مراحلہ طے کرنے کے کام کو فیصلہ کن اہمیت دیں، جن صلاحیتوں کے ذریعہ امت نے ہر دور میں داخلی اور خارجی طاغوت کا مقابلہ کیا ہے۔ اور جس کے ذریعہ اب تک اسلام کے تسلسل کو قائم رکھنے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

دل، محبوب حقیقی کی محبت کا مرکز ہے۔ جب اس دل میں محبوب حقیقی کی محبت غالب آجاتی ہے اور طاقتور ہو جاتی ہے کہ تو افرادِ ملت کے ساتھ خدائی طاقت شامل ہو جاتی ہے پھر محبت سے سرشار دل خدا کے سوا کسی طاقت سے خوف زدہ نہیں ہوتا، اللہ کی نصرت کے سلسلہ میں وہ یقین سے بہرہ ور ہو جاتی ہیں۔ دوسری سب سے اہم بات یہ ہوتی ہے کہ سلامتیٔ قلب کا حامل معاشرہ اخلاقی وروحانی طور پر اتنا طاقتور ہو جاتا ہے کہ اس معاشرہ میں دولت کے انبار

خرچ کرنے کے باوجود دشمن کو اپنے نظریات اور اپنی تہذیب کے حامل افراد نہیں مل پاتے، اگر مل بھی جاتے ہیں تو معاشرہ کا اجتماعی ضمیر زندہ ہونے کی وجہ سے ایسے افراد کے لئے معاشرہ میں کام کی راہیں مسدود ہوجاتی ہیں۔

دل کی سلامتی کے کام کی اس فیصلہ کن اہمیت کے پیش نظر ضرورت ہے کہ ہماری دینی وسماجی تنظیمیں وادارے اور دینی درسگاہیں افراد کو روحانی اور اخلاقی طور پر مستحکم کرنے اور فطرت میں موجود محبوب حقیقی سے محبت کے طاقتور داعیے کو بیدار کرنے اور طاقتور بنانے کے کام کو فیصلہ کن اہمیت دیں۔ اسی کام سے انہیں اخلاقی اعتبار سے مستحکم اور طاقتور افراد ملیں گے اور یہی چیز تنظیموں، اداروں اور معاشرے کے استحکام اور دشمن کی طرف سے مسلط کی ہوئی تہذیبی جنگ سے مقابلہ کے سلسلہ میں فیصلہ کن کردار ادا کرے گی۔

(۳)

حقیقت یہ ہے کہ ایسا معاشرہ، جو فطرت میں موجود نصب العینی داعیے یعنی اللہ کی محبت سے محروم ہے اور جو دل کی صلاحیتوں کے بیداری کے کام سے غافل ہے، وہ معاشرہ ہر طرح کے فتنوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے اور داخلی وخارجی دشمن اس کی نفس پرستی کی قوتوں کو مشتعل کرکے، اسے آسانی سے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔

اس وقت ہمارا معاشرہ جو منظر پیش کررہا ہے، وہ یہی ہے کہ معاشرہ کا ہر طبقہ دولت پرستی کے جنوں میں مبتلا ہوگیا ہے۔ یہ دولت رشوت کے ذریعہ حاصل ہو یا دوسروں کی جائداد واملاک پر قبضہ کی صورت میں، سرکاری رقوم میں خورد برد کے ذریعہ حاصل ہو یا لوگوں کے جیبوں پر ڈاکہ ڈالنے کے ذریعہ یا قومی اور ریاستی پالیسیوں کا اختیار دشمن کو دینے کے ذریعہ حاصل ہو، غرض دولت کا حصول ہے۔

نفس پرستی، دولت پرستی اور ملت فروشی کی اس حالت کی فروغ پذیری کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ ہمارے بیشتر تعلیمی وتربیتی ادارے حقیقی نصب العین سے عاری افراد تیار کرکے معاشرہ کو دے رہے ہیں۔ تعلیمی اداروں سے ہر سال ایسے لاکھوں افراد نکلتے ہیں جو

فطرت میں موجود اصل نصب العین اور اس کی صلاحیتوں کے ادراک سے قاصر ومحروم ہوتے ہیں۔

ایسے افراد عالمی ساہوکار اور نفس پرستی کی داخلی قوتوں کے آلہ کار بن کر معاشرہ وریاست کو تلپٹ کرنے کا کردار ادا نہ کریں گے تو اور کیا کریں گے۔

ان حالات میں بیدار ہونے اور سنبھلنے کی ضرورت ہے اور جماعتوں، تنظیموں، اداروں، اور درسگاہوں کے ذمہ داروں کو بالخصوص معاملہ کی نزاکت وسنگینی کا احساس ہونا چاہئے کہ ذہنی تربیت کے ساتھ ساتھ دل کی تربیت اور محبوب حقیقی کے ساتھ دل کی بے پناہ تڑپ وطلب کی تسکین کا انتظام ہونا چاہئے، اس کام کو خصوصی وفیصلہ کن اہمیت دینا چاہئے۔

(۴)

دل کی تربیت، اس کی سلامتی کی راہ اور دل کی الجھنوں کے حل اور دل کی وسیع تر دنیا کی گہرائیاں یہ ایسے کام ہیں، جن کے ماہر درویش خدا مست افراد ہی ہیں۔ جو اپنی زندگی کا بڑا حصہ نفس پرستی کی قوتوں کی تہذیب اور سلامتیٔ دل کے کام میں صرف کرچکے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق ایسے اشخاص قیامت تک قائم وموجود رہیں گے۔ اس وقت بھی یقیناً ایسے افراد موجود ہیں، لیکن معاشرہ میں طلب نہ ہونے کی وجہ سے ایسے افراد ہمیں نظر نہیں آتے، ضرورت ہے کہ ایسے درویش خدا مست افراد کو تلاش کرکے اخلاقی وروحانی تربیت کے لئے ان کی خدمات سے بھرپور استفادہ کیا جائے، اس مقصد کے لئے جماعتوں، تنظیموں، اداروں اور درسگاہوں کے ذمہ داروں کو آگے بڑھکر کردار ادا کرنا ہوگا، ایسے افراد کو اپنی جماعتوں، اداروں اور درسگاہوں میں بلا کر، اپنے ذہین وباصلاحیت افراد کو ان کے سپرد کرنا ہوگا، تاکہ وہ سلامتی دل کے ذریعہ ان کی پاکیزہ نصب العین کی بنیاد پر صحیح سمت میں تربیت کا کام کرسکیں، اس طرح معاشرہ کو ہماری پاکیزہ تہذیب سے ہمہ آہنگ مضبوط سیرت وکردار کے حامل باصلاحیت افراد (جو کسی قیمت پر فروخت نہ ہوسکیں اور جو ملی

مفادات کے جذبات سے سرشار ہوں) تیار ہوسکیں۔ ایسے باصلاحیت افراد کی تیاری سے ہی ہماری ریاست کے سارے ادارے اور سارے شعبے مستحکم ہوں گے اور ان اداروں میں موجود ساری خرابیوں کے ازالہ کی ازخود صورت پیدا ہوتی چلی جائے گی۔

تہذیب نفس اور دل کی سلامتی کا کام ایسا ہے، جو دوسرے سارے کاموں پر فوقیت رکھتا ہے۔ اس کام کی اس فیصلہ کن اہمیت کو سمجھکر اسے ترجیح دینا وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔

الحمدللہ ہمارے معاشرہ میں ایسے افراد موجود ہیں، جو اس کام کا کچھ نہ کچھ ادراک ضرور رکھتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ اس اعتبار سے معاشرہ بالکل بانجھ ہو چکا ہے، ضرورت ہے کہ حوصلہ اور ہمت سے کام لے کر ہمارے اداروں اور درسگاہوں کے ذمہ دار اس سلسلہ میں صحیح فیصلے فرمائیں۔

ہم یہ ہرگز نہیں کہنا چاہتے اور نہ ہی ہمیں یہ کہنے کا کوئی حق حاصل ہے کہ ہمارے معاشرہ کے سارے ذمہ دار طبقات دل کے حوالے سے بات سننے کے لئے تیار نہیں اور دل کے حوالے سے وہ اندھے پن اور سماعت کے اعتبار سے وہ بہرے پن کا مظاہرہ کررہے ہیں۔ خدا نہ کرے ایسی صورتحال نہیں ہے۔ لیکن یہ کہے بغیر بھی چارہ کار نہیں کہ اس اعتبار سے سارے ذمہ دار طبقات پر بے حسی غالب ہے اور وہ اس سلسلہ میں کوئی فیصلہ کن کردار ادا کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ یہ ایسی المناک صورتحال ہے، جس پر خون کے آنسو بہائے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ جس کام سے ملت کی تعمیر کے بیشتر کام وابستہ ہیں، اس کام کے بارے میں بے حسی کا مظاہرہ، قوم وملت کو دوراہے پر کھڑا کرنے کے مترادف ہے۔

اس سلسلہ میں ہم مزید کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتے، اشاروں وکناروں میں وہ سب کچھ عرض کیا جا چکا ہے، جو دردمند اور ملت کا بہی خواہ فرد کہہ سکتا ہے۔

اللہ کی محبت

خصوصیات وعلامتیں

امام غزالی کی نظر میں

امام غزالی نے احیاء العلوم میں اللہ کی محبت کے موضوع پر سو صفحات کے لگ بھگ بحث کی ہے، یہاں اس بحث کے کچھ اہم نکات پیش کئے جاتے ہیں۔

''حضرت ابوبکر صدیق کا ارشاد ہے کہ اللہ سے محبت کرنے والے کو جو لذت حاصل ہوتی ہے ایسی لذت ہوتی ہے جو اسے دنیا سے روک دیتی ہے اور لوگوں سے اسے وحشت زدہ کردیتی ہے۔

حضرت ابوسلیمان درانی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص آج اپنے نفس میں مشغول ہوگا وہ کل بھی اس میں مشغول رہے گا اور جو اپنے رب میں مشغول ہوگا۔ وہ کل بھی اسی میں مشغول ہوگا۔

حضرت رابعہ بصری اللہ سے محبت کے سلسلہ میں اپنے اشعار میں کہتی ہیں۔

میں تجھ سے دو طرح کی محبت کرتی ہوں۔ ایک محبت عشق کی وجہ سے ہے اور دوسری محبت اس لئے ہے کہ تو اس کا اہل ہے، عشق کی بنا پر جو محبت ہے اس کے باعث میں تیرے سوا ہر چیز سے بے نیاز ہو کر تیرے ذکر میں مشغول ہوں، اور محبت جو تیرے شایان شان ہے اس کے باعث تو نے پردے کھول دیئے ہیں تاکہ میں تیرا مشاہدہ کرسکوں، میرے لئے نہ اس محبت میں کوئی تعریف ہے اور نہ اس میں دونوں محبتوں میں تعریف تیرے لئے ہی ہے۔

شاید حضرت بصری نے محبت عشق سے وہ مراد لی ہو جو اس کے احسانات وانعامات کے باعث بندے کو اللہ سے ہونی چاہئے اور دوسری محبت سے وہ مراد لی ہو جو صرف اس کے جلال وجمال کے باعث ہو، اور یہ جلال وجمال دوام ذکر کے باعث اس پر منکشف ہوگیا ہو

اور یہ دونوں محبتوں میں اعلیٰ وارفع ہے۔''

''حقیقت یہ ہے کہ جو شخص دنیا میں اللہ کو نہیں پہنچانتا ہے وہ آخرت میں بھی اسے نہیں دیکھ پائے گا اور جو اس کی معرفت سے دنیا میں خط نہیں اٹھاتا، وہ آخرت میں بھی دیدار الٰہی سے لطف انداز نہیں ہو سکے گا اس لئے کہ اگر دنیا میں کسی کے ساتھ کچھ نہیں تو وہاں کوئی نہیں بات نہیں ہو سکے گی، جب تک کوئی شخص بوئے گا نہیں تو کاٹے گا کیسے؟ ہر شخص کا حشر اسی حال پر ہوگا، جس حال پر وہ مرے گا۔''

''عارف کی معرفت دنیا میں کتنی ہی قوی کیوں نہ ہو، لیکن اس کی بیشی اس کا دامن نہیں چھوڑتی، عارف کا ان سے خالی ہونا ناممکن ہے، تاہم یہ مواقع بعض حالات میں کمزور ہو جاتے ہیں اور بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اب کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی۔ اس وقت نگاہیں معرفت کے جمال کی چمک دمک سے خیرہ ہو جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ عقل حیران ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات یہ لذت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ دل میں برداشت کا حوصلہ نہیں رہتا، ایسا لگتا ہے کہ دل پھٹ جائے گا۔ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے گا۔ لیکن لذت اندوزی کی یہ حالت ہمیشہ برقرار نہیں رہتی، بلکہ دل پر اس طرح وارد ہوتی ہے، جیسے آسمان پر بجلی چمک جائے، بسا اوقات عارف کے دل و دماغ پر افکار و حوادث کا حملہ ہوتا ہے، یہ افکار اس کا سارا لطف خاک میں ملا دیتے ہیں۔ اس حیات ناپائدار میں یہ صورتحال اکثر پیش آتی رہتی ہے، اس لئے کہ کوئی عارف یہ دعویٰ مشکل ہی کر سکتا ہے کہ وہ معرفت الٰہی سے پوری طرح لطف اندوز ہوا ہے۔ موت تک یہ سلسلہ یوں ہی دراز رہتا ہے۔

معرفت کی مثال ایک بیج کی سی ہے، تم اس کی جس قدر آبیاری اور نگہداشت کرو گے، اسی قدر وہ تناور درخت بنے گا اور تمہیں شیرین پھل دے گا، معرفت ایک نہ ختم ہونے والا سمندر ہے، جو شخص اس سمندر میں اپنی کشتی ڈالتا ہے، وہ کبھی پار نہیں لگتا اور نہ اس سمندر کی تہہ تک پہنچ پاتا ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کے جلال و جمال کے حقائق کا مکمل ادراک محال ہے، لیکن اس کے افعال صفات اور اسرار کی معرفت جتنی زیادہ ہوگی، اسی قدر آخرت کی لذت بھی

بڑھے گی، معرفت کا بیج بونے کے لئے دنیا ناگزیر ہے، دل اس کی زمین ہے، اس کے پھل آخرت میں ملتے ہیں۔ (اگرچہ دنیا میں بھی فرد کو اس کا ایک حصہ ملتا ہے کہ اس کے جذبات حسن کی کسی حد تک تسکین ہوتی ہے)۔

آخرت میں سب سے زیادہ خوشحال اور صاحب سعادت وہ شخص ہوگا، جو اللہ کی محبت میں سب سے زیادہ پختہ ہوگا۔ اس لئے آخرت کے معنی ہیں، اللہ کے پاس آنا، اس کی ملاقات کا شرف حاصل کرنا۔ عاشق کے لئے اس سے بڑھکر کیا نعمت ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے طویل شوق ملاقات کے بعد محبوب کے پاس آئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کے مشاہدے کی سعادت حاصل کرے۔ نہ کوئی رکاوٹ ہو، نہ مزہ مکدر کرنے والا ہو، نہ حاسد و مخالف ہو، نہ یہ خوف ہو کہ مشاہدہ منقطع ہو جائے گا۔ لیکن یہ نعمت، محبت کی قوت کے بقدر حاصل ہوگی، جتنی زیادہ محبت ہوگی، اسی قدر لذت بھی زیادہ ہوگی۔

اللہ سے تعلق مستحکم کرنے کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

بندہ، دنیاوی تعلقات (غیر ضروری) سے اپنا ناتہ توڑے، اور دل سے غیر اللہ کی محبت نکال ڈالے، دل ایک برتن کی طرح ہے، جس میں اس وقت تک سرکے کی گنجائش نہیں ہوتی، جب تک اس سے پانی نہ نکا دیا جائے، یہ توقع نہ رکھی جائے کہ بیک وقت اللہ کی محبت بھی دل میں سما سکتی ہے اور دنیا سے وابستگی بھی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کے سینے میں دو دل نہیں بنائے، کمال یہ ہے کہ فرد اپنے پورے دل کے ساتھ اللہ سے محبت کرے، جب تک وہ کسی غیر کی طرف ملتفت رہے گا، اس کے دل کا ایک گوشہ غیر اللہ میں مشغول رہے گا اور اسی قدر اس کی محبت ناقص ہوگی، اور وہ اسی قدر غیر اللہ میں مشغول ہوگا، چنانچہ جس طرح برتن میں پانی رہے گا، اسی قدر اس میں سرکہ کم آئے گا۔''

فرد کا جس قدر دنیا سے انس زیادہ ہوگا، اسی قدر اللہ سے اس کی انسیت میں کمی واقع ہوگی۔ فرد کو دنیا میں جس قدر حصہ ملتا ہے، اسی قدر آخرت میں اس کا حصہ کم کر دیا جاتا ہے، جیسے فرد مغرب سے جتنا قریب ہوگا، اتنا ہی مشرق سے دور ہوتا ہے یا جیسے ایک شوہر اپنی ایک

بیوی کو جتنا خوش کرے گا، اسی قدر اس کی دوسری بیوی اس سے ناراض ہوگی۔''

''آہستہ آہستہ قلب کی یہ حالت ہوجاتی ہے کہ اس میں مال وجاہ اور دوسری دنیاوی لذتوں کی طرف ذرا بھی رغبت باقی نہیں رہتی، بلکہ دل تمام نجاستوں سے پاک وصاف ہوجاتا ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کی پاکیزہ محبت کے چراغ روشن ہوجاتے ہیں، اس کے بعد معرفت الٰہی اور محبت الٰہی کے لئے گنجائش پیدا ہوتی ہے۔''

''اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ اے داؤد، جو لوگ مجھ سے منہ موڑ لیتے ہیں اور میری اطاعت سے راہ فرار اختیار کرتے ہیں، اگر انہیں معلوم ہوجائے کہ مجھے ان کا کس قدر انتظار ہے اور میں ان سے کتنی نرمی اور مہربانی کا معاملہ کرنا چاہتا ہوں اور مجھے کس قدر شوق ہے کہ وہ گناہوں سے بچے رہیں، اگر انہیں یہ تمام باتیں معلوم ہوجائیں تو وہ مجھ سے ملنے کے اشتیاق میں اس قدر بے چین ہوجائیں کہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں اور میری محبت کی تپش میں ان کے اعضا ایک دوسرے سے جدا ہوجائیں، اے داؤد، دوری اختیار کرنے والوں کے لئے میرا ارادہ یہی ہے، اس سے اندازہ لگا لو کہ مجھ سے لو لگانے والوں کے لئے میرا ارادہ کیا ہوگا، اے داؤد، جب بندہ مجھ سے بے نیاز ہوتا ہے تو وہ رحم وکرم کا زیادہ محتاج ہوتا ہے اور جب وہ میری طرف سے دوری اختیار کرتا ہے تو مجھے اس پر زیادہ رحم آتا ہے۔''

''محبت کی کچھ علامات ہیں، جو کچھ احادیث میں بیان فرمائی گئی ہیں۔

ایک حدیث میں ہے۔

جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اسے آزمائش میں مبتلا کردیتا ہے، اگر وہ ابتلا پر صبر کرتا ہے تو اسے برگزیدہ کرتا ہے اور اگر راضی ہوتا ہے تو اسے (اپنے خاص بندوں میں) منتخب کرلیتا ہے۔

دوسری حدیث شریف میں ہے۔

جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اس کے نفس میں ایک نصیحت کرنے والا

مقرر کردیتا ہے اور اس کے دل میں (گناہوں سے) ایک روکنے والا پیدا کردیتا ہے، جو اسے (نیکی کا) حکم دیتے ہیں اور (بُرائی سے) روکتے ہیں۔

''وہ چیزیں جس سے معلوم ہو کہ بندہ خدا کا محبوب ہے، یہ ہیں: اللہ تعالیٰ اس کے تمام ظاہری وباطنی معاملات کا کفیل ہو۔ وہی اسے مشورہ دیتا ہو، وہی اسے تدبیر سجھاتا ہو، وہی اسے زیور اخلاق سے آراستہ کرتا ہو، وہی اس کے اعضاء کو نیک کاموں میں استعمال کرتا ہو، وہی اس کے ظاہر وباطن کو درست رکھتا ہو، وہی اس کے افکار کا ایک مرکز بناتا ہو، وہی اس کے دل میں دنیا کی نفرت پیدا کرتا ہو، وہی اس سے غیر سے بیزار کرتا ہو، اور خلوتوں میں مناجات کی لذت بخش کر، خود سے مانوس کرتا ہو، وہی اپنی معرفت اور اس کے درمیاں سے پردے اٹھاتا ہو۔

یہ اور اس طرح کی دوسری علامات بندے کے لئے اللہ تعالیٰ کی محبت پر دلالت کرتی ہیں۔''

''موت سے محبت رکھنا بھی اللہ سے محبت کی علامتوں میں سے ہے، بندے کو چاہئے کہ موت سے فرار اختیار نہ کرے، محبت کرنے والا کبھی اپنے محبوب کے وطن کے سفر کرنے میں مشقت یا تکلیف محسوس نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس سفر کا انجام محبوب کا مشاہدہ ہے، اور یہ سفر اس مشاہدہ کی کنجی ہے۔

''رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں جو شخص اللہ کی ملاقات کو پسند کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی ملاقات کو پسند کرتا ہے۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص کسی ایسے فرد کو دیکھے، جو اللہ تعالیٰ سے اپنے پورے دل کے ساتھ محبت کرتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ (حضرت) سالم کو دیکھے۔

اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ لوگوں میں ایسے افراد بھی ہیں، جو پورے دل کے ساتھ اللہ سے محبت نہیں کرتے، بلکہ دوسروں سے بھی محبت کرتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہی کہ جب وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوں تو انہیں ان کی محبت کے مقدار کے مطابق دیدار

الٰہی کی لذت حاصل ہو اور انہیں دنیا سے محبت کے بقدر عذاب ملے۔''

حضرت سفیان ثوری فرماتے ہیں، جو شخص اللہ کے محبّ (محبت کرنے والے) سے محبت کرتا ہے، وہ گویا اللہ سے ہی محبت کرتا ہے۔

اور جو شخص اللہ تعالیٰ کا اکرام کرنے والے سے محبت کرتا ہے، وہ گویا اللہ تعالیٰ کا اکرام کرتا ہے۔''

حضرت سہیل تستری فرماتے ہیں: محبت الٰہی کی علامت محبت قرآن ہے، محبت الٰہی اور محبت قرآن کی علامت محبت رسول اللہ ﷺ ہے۔ اور محبت رسول ﷺ کی علامت سنت رسول ﷺ کی محبت ہے اور محبت سنت رسول اللہ ﷺ کی علامت آخرت کی محبت ہے اور محبت آخرت کی علامت دنیا سے نفرت ہے اور بغض دنیا کی علامت یہ ہے کہ فرد دنیا سے اس قدر لے، جو آخرت میں اس کے کام آسکے۔''

''حضرت داؤد علیہ السلام کے اخبار میں ہے کہ مخلوق میں سے کسی سے مانوس مت ہو، میں دو شخصوں کو اپنے سے علیحدہ رکھوں گا۔ ایک وہ شخص جس نے یہ سمجھا کہ میرے موت میں تاخیر ہے، اس لئے فی الحال عمل کی کیا ضرورت ہے۔ اور دوسرا وہ شخص، جس نے مجھے فراموش کیا اور اپنے حال پر راضی رہا اور اس کی علامت یہ ہے کہ میں اسے اس کے نفس کے سپرد کر دیتا ہوں، اور دنیا میں حیران و پریشان چھوڑ دیتا ہوں، فرد، جس قدر اللہ تعالیٰ سے ناموس ہوتا ہے، وہ اسی قدر غیر سے مانوس ہوتا ہے۔ اور جس قدر غیر سے مانوس ہوتا ہے، اسی قدر اللہ سے وحشت میں مبتلا ہوتا ہے اور محبت سے دور ہوتا ہے۔''

بعض اہل اللہ نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک اہل اللہ کہتے ہیں کہ مجھے ارادت کے دنوں میں مناجات کی لذت ملی، چنانچہ میں رات دن قرآن کی تلاوت کو اپنا مشغلہ بنالیا، پھر کچھ وقفہ ایسا گذرا کہ میں تلاوت نہ کر سکا، ایک دن میں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی کہنے والا یہ کہہ رہا ہے کہ اگر تجھے ہماری محبت کا دعویٰ ہے تو ہماری کتاب قرآن کریم پر کیوں ظلم کرتا ہے،

کیا تو نے ہماری اس لطیف عتاب پر تدبر نہیں کیا، جو قرآنی آیات میں موجود ہے، جب میں اس خواب کے بعد نیند سے بیدار ہوا تو دل قرآن کریم کی محبت سے لبریز تھا۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، تم میں سے کوئی شخص قرآن کریم کے علاوہ اپنے نفس سے کوئی چیز پسند نہ کرے، اس لئے کہ جو قرآن کریم سے محبت کرتا ہے، وہ اللہ سے محبت کرتا ہے اور جو قرآن کریم سے محبت نہیں کرتا، وہ اللہ سے بھی محبت نہیں کرتا۔''

''محبت کی ایک علامت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سارے بندوں سے رحمت وشفقت کا معاملہ ہو، اور ان لوگوں سے دشمنی ہو، جو اللہ کے دشمن ہیں اور اس کی مرضی کے خلاف ہوں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے'' (یہ صحابہ کرام) کافروں کے مقابلہ میں سخت ہیں اور آپس میں مہربان ہیں۔'' ایسا کرنے سے کسی ملامت کرنے والے کی ملامت نہ روکے اور نہ اللہ تعالیٰ کے غصہ کرنے میں کوئی چیز روکے۔

ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کا یہی وصف بتایا ہے، یعنی وہ لوگ جو میری محبت میں اس طرح فریفتہ ہیں، جس طرح بچہ کسی چیز پر فریفتہ ہوتا ہے اور میرے ذکر پر اس طرح گرتے ہیں، جس طرح پرندہ اپنے گھونسلے پر گرتا ہے، میرے گناہوں کے ارتکاب کے منظر سے اس قدر برافروختہ ہوتے ہیں، جیسے چیتا اپنے شکار کو دیکھکر غراتا ہے، پھر اسے یہ پرواہ نہیں ہوتی کہ آدمی کم ہیں یا زیادہ۔

''درجات قرب کی کوئی انتہا نہیں ہے، بندہ کا حق یہ ہے کہ وہ ہر لمحے قرب کے مرتبوں میں زیادتی کے لئے کوشاں رہے، تاکہ زیادہ سے زیادہ قربت حاصل کرے، اس لئے سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کے دونوں دن برابر ہوں، وہ خسارے میں ہے اور جس کا آج، کل سے بُرا ہو، وہ ملعون ہے۔

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ میرے دل پر میل آجاتا ہے تو میں دن اور رات میں ستر مرتبہ استغفار کرتا ہوں۔''

سالکین کا راہ سلوک میں کہیں ٹھر جانا بھی کسی عذاب سے کم نہیں، جیسا کہ ایک حدیث قدسی میں وارد ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب کوئی عالم میری اطاعت کے مقابلہ میں دنیا کی محبت اور شہوات کو ترجیح دیتا ہے تو میں اسے کم سے کم یہ سزا دیتا ہوں کہ اس سے مناجات کی لذت سلب کر لیتا ہوں۔'' (احیاء العلوم جلد چہارم، کتاب المحبت والشوق)

روح اور روحانی تقاضے

انسان کی اصل شخصیت روح سے عبارت ہے۔ جب کہ مادی جسم روح کے لئے سواری کی حیثیت رکھتا ہے۔ سواری کی بھی اپنی جگہ اہمیت ہے، لیکن اصل اہمیت سوار کی ہے، روح ایک جوہر ہے، جو مادی انسان میں اس طرح فٹ کر دیا گیا ہے کہ بظاہر محسوس نہ ہوتے ہوئے بھی اس مادی انسان کو زندہ اور قائم رکھے ہوئے ہے۔ جب انسانی جسم سے روح نکل جاتی ہے تو مادی جسم کے سارے عناصر موجود ہوتے ہوئے بھی یہ جسم مردہ لاش ہوتی ہے جو سننے، بولنے اور احساس وغیرہ کی صلاحیت سے قاصر ہوتی ہے۔ روح نے عالم امر میں محبوب کی ایسی صدا سنی ہے اور اس کے انوار حسن کا ایسا مشاہدہ کیا ہے کہ مادی جسم میں موجود ہوتے ہوئے بھی وہ محبوب کی اس صدا کی گونج سے حالت وجد میں آئی ہے۔ الست بربکم کی اس صدا کا جواب قالوا بلیٰ کی صورت میں روح کی طرف سے دیا گیا تھا، الست بربکم کا جو عہد اللہ نے روحوں سے لیا تھا، اس کا مطلب یہ تھا کہ ارواح ہر طرح کی حالت میں محبوب حقیقی کو خالق، مالک اور معبود سمجھکر، اس کی عبادت کریں گی، اس کی محبت سے سرشار ہو کر دوسری محبتوں کو اس کے تابع رکھیں گی۔

اور اللہ محبوب کی ذات وصفات میں کسی کو شریک نہ کریں گی، وہ توحید اور توحید پرستی کے سلسلہ میں کسی مداہنت اور دوئی ودورنگی سے کام نہ لیں گی۔ اللہ محبوب سے کیا گیا ارواح کا یہ عہد ایسا پختہ اور مستحکم عہد تھا کہ روح کی ساری حسرتیں اور اس کے سارے تقاضے اسی عہد پر عمل پیرا ہونے سی ہی وابستہ ہیں۔ انسانی شخصیت میں روح کی فیصلہ کن اہمیت کی وجہ سے حقیقی خوشی ومسرت اور غموں اور دکھوں کے احساس کا سب سے بڑا مرکز روح کی ہستی ہی ہے، جس طرح پیٹ کی غذا ہے، عقل کی غذا ہے، اسی طرح روح کی بھی غذا ہے، روح کی غذا

محبوب حقیقی سے والہانہ محبت کے اظہار کے ذریعہ اس کے انوار حسن کا مشاہدہ ہے، جو عبادت، ذکر وفکر اور اللہ کی اطاعت کی صورت میں اسے حاصل ہوتی ہے۔ روح کی خصوصیت اس کے علاوہ کوئی نہیں، کہ وہ محبوب حقیقی کی مخلصانہ عبادت واطاعت سے بے پناہ خوش ہوتی ہے، عبادت سے انکار کی روش سے وہ بے حد مفہوم اور دکھی ہوتی ہے، روح اپنی خوشی وغم کے ان احساسات کو دل، عقل اور نفسیات کی طرف منتقل کرتی رہتی ہے، جس سے دلی، دماغی، اعصابی اور نفسیاتی نوعیت کے بے شمار امراض پیدا ہوتے ہیں اور انسانی معاشرہ فساد سے دوچار ہونے لگتا ہے۔

انسان کی اصل شخصیت یعنی روح کی رہنمائی کے لئے اگرچہ الست بربکم کی صدا کافی تھی کہ یہی فطرت کی سب سے طاقتور ترین صدا ہے، لیکن اس کے باوجود اللہ نے انسانوں کی رہنمائی کے لئے ہر دور میں انبیاء کرام بھیجے، تاکہ روح اور فطرت کی مزید تائید کی صورت پیدا ہو اور انسان کی صحیح رہنمائی کرکے، اس پر اتمام حجت کیا جائے اور اللہ محبوب کی عبادت، اس سے والہانہ محبت اور اس کی اطاعت سے انکار کے جواز کے بہانے ختم کردیئے جائیں۔

روح کے حوالے سے ہم علمی اور متکلمانہ بحث میں جائے بغیر یہ کہیں گے کہ محبوب حقیقی سے والہانہ محبت کے ذریعہ روح کی صلاحیتوں کو بیدار کرنے کے بعد فرد وافراد یہ گواہی دینے لگتے ہیں کہ ان کے سارے جذباتِ حسن کی تسکین کی صورت ازخود پیدا ہونے لگتی ہے۔ اس کے بعد مادی خواہشات ومادی جذبات کی حیثیت جسمانی وجود کو قائم رکھنے سے زیادہ نہیں ہوتی۔ یعنی روح کے جذبات حسن کی تسکین کے بعد فرد وافراد میں یہ تمنا وحسرت باقی نہیں رہتی کہ مادی زندگی جو ناپائیدار ہے، اور حقیقی جسمانی تقاضے جو محدود نوعیت کے ہیں، اپنی بیشتر صلاحتیں ان تقاضوں کی تکمیل کی جدوجہد میں صرف کی جائیں۔ روح کی طمانیت وتسکین سے دل، عقل اور نفسیات وغیرہ ان سب کی تسکین کی ازخود صورتیں پیدا ہوجاتی ہیں۔

اس کے بعد فرد وافراد کی جدوجہد کا سارا رخ دنیا میں محبوب حقیقی کی مرضیات کو فروغ

دینے اور نفس پرست ومادہ پرست افراد کو اصل انسانی شخصیت کے تقاضوں سے آشنا کرنے اور روح کی بالیدگی کی جدوجہد میں صرف ہونے لگتا ہے۔

روح کی اصل حقیقت اور اس کا اصل اضطراب یا خوشی تو دوسری دنیا میں ہی ظاہر ہوگی، لیکن اس دنیا میں بھی اہل اللہ، روح کو لطیف سے لطیف تر بنانے کی جدوجہد اور اس میں کامیابی نے مراحل طے کرتے ہوئے جس حلاوت وخوشی سے بہرہ ور ہوتے ہیں، وہ ایسی حلاوت ہے، جو ساری دنیا کی حلاوتوں پر بھاری ہے۔

روح کو اللہ کی محبت، اس کی عبادت واطاعت سے محروم کرنے کے بعد آخرت میں فرد وافراد جس اذیت سے دوچار ہوں گے، اس کا قرآن میں اس طرح ذکر ہوا ہے۔

ولایکلمه الله ولا ینظر الیهم یوم القیامة . (آل عمران آیت ۷۷) اللہ ان سے قیامت کے دن نہ تو گفتگو کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ ان کا تزکیہ کرے گا)۔

اس آیت کی تفسیر میں ایک مفسر لکھتے ہیں: **لایکلمهم الله.** کی دھمکی سے یہ امر صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہر کسی کے دل میں محبت الٰہی خوب راسخ ہے، اگرچہ سردست محسوس نہ ہو، جب قیامت کے دن ساری رکاوٹیں دور ہوں گی تو اس کا یعنی محبت کا ظہور کامل ہوگا۔ کیونکہ اگر یہ نہ ہوتا تو کفار کو یہ دھمکی ایسی ہوگی کہ کوئی اپنے دشمن کو ناخوشی اور اعراض سے ڈرانے لگے جو بالکل بے سود ہے۔ محبان جانثار محبوب کی دوری اور عتاب کو درد جانگداز سمجھتے ہیں نہ اعدا، بس معلوم ہوا کہ قیامت کے دن ہر سینہ اللہ کی محبت سے ایسا لبریز ہوگا کہ اللہ کی بے التفاتی (یعنی دھمکی) عذاب دوزخ سے بھی زیادہ ان کو جان کاہ معلوم ہوگی۔ (تفسیر عثمانی، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ)

محبوب کے لئے روح کے ان شدید اور بے پناہ تقاضوں کو دیکھتے ہوئے بیدار ہوکر مجاہدوں کی راہ پر گامزن ہونے کی ضرورت ہے تاکہ اس دنیا میں بھی فرد وافراد کے سارے جذبات حسن کی تسکین کی صورت پیدا ہوسکے تو آخرت میں بھی محبوب کی طرف سے مذکورہ

دھمکی اوران کے اعراض سے بچاؤ کی صورت پیدا ہو سکے۔

روح کی تسکین محض بے جان اور رسمی اطاعت سے نہیں ہوسکتی، اس کی تسکین تو اپنی بیشتر توانائیوں کو محبوب کی محبت کے جذبات کو فروغ دیتے رہنے، اس کے لئے والہانہ پن کا مظاہرہ کرنے اور اس کی مخلصانہ اطاعت سے ہی ہوسکتی ہے۔

فرد کی تعمیر و بگاڑ اور نشو ونما میں

عادتوں کا کردار

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ فرد وافراد کے عقائد، خیالات اور اعمال میں پیدا ہونے والا سارا بگاڑ غلط اور منفی عادتوں کو مستحکم کرنے کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے۔

قرآن نے جن زوال پذیر اور اللہ کے عذاب کی شکار قوموں کا ذکر کیا ہے، جو اللہ کے پیغمبروں کی زندگی بھر کی کوششوں کے باوجود سرکشی پر قائم رہیں، ان ساری قوموں کا بنیادی المیہ یہی تھا کہ وہ فساد زدہ ماحول کے زیر اثر اپنی فطرت سلیمہ کو مسخ کر چکی تھیں اور توحید کے منافی عقائد واعمال میں راسخ ہو چکی تھیں۔

منفی عقائد وافکار یا منفی عادتوں کی روش اختیار کرنے کا سب سے خطرناک نتیجہ جو نکلتا ہے، وہ یہ ہے کہ عام طور پر ان سے جان خلاصی کی صورت پیدا نہیں ہو پاتی، اس لئے کہ وہ عادتیں مستحکم ہو کر، مزاج کا حصہ بن جاتی ہیں اور ان کا ملکہ راسخ ہو جاتا ہے۔ اس لئے زندگی کے ہر موڑ پر خود احتسابی کے ذریعہ اس بات کا جائزہ لیتے رہنے کی سخت ضرورت ہے کہ کہیں ہماری شخصیت میں عقائد وخیالات میں بگاڑ اور صحیح اسلامی عقائد کے منافی عقائد اور غلط اعمال کی عادت تو پیدا نہیں ہو رہی ہے یا ہوگئی ہے، جوں ہی نفسی کی اکساہٹ یا خراب ماحول کے اثرات کی وجہ سے خلاف اسلام حرکت صادر ہو جائے تو قبل اس کے کہ یہ مزاج کا حصہ بنتی جائے، اس عمل سے باز آ کر صحیح عمل اختیار کیا جائے اور صحیح اعمال کی عادت کو مستحکم سے مستحکم تر کرنے کی کوشش کی جائے۔

میں اس سے آگے بڑھکر یہ کہوں گا کہ اگر ہم خود احتسابی سے کام لے کر اپنے اعمال کا جائزہ لیں گے تو ہمیں نظر آئے گا کہ ہمارے کئی ظاہری وباطنی اعمال ایسے ہیں، جو ہماری شخصیت کو اسلامی نقطہ نگاہ سے داغدار بنانے اور ہمارے لئے صحیح مسلمان کی حیثیت سے زندگی

گذارنے کی راہ میں حائل ہیں، چونکہ ہم ایک عرصہ سے یہ منفی عادتیں اختیار کرتے رہے ہیں، اس لئے ان عادتوں کے منفی ہونے کے بارے میں ہمارا شعور وادراک یا تو سلب ہوگیا ہے یا وہ بہت ضعیف ہوگیا ہے۔ اور ان غلط اعمال کو مسلسل اختیار کرنے کے نتیجہ میں اندر کا مفتی بھی اس سلسلہ میں فتویٰ دینے سے قاصر ہوگیا ہے۔

اگر چہ ذکر اور صحبت میں دوام کے نتیجہ میں یہ منفی عادتیں (جو ظاہری ہوں یا باطنی) بتدریج ان سے نجات کی صورت پیدا ہوتی جائے گی۔ لیکن بعض اوقات یہ منفی عادتیں اتنی طاقتور ہوتی ہیں کہ ذکر اور صحبت کے طویل عرصہ تک مسلسل اہتمام کے بعد کہیں جا کر ان سے جان خلاصی کی صورت پیدا ہوتی ہے، اس لئے اس طویل عرصہ کا انتظار کئے بغیر راہ سلوک میں چلنے والے سالکوں کو خود احتسابی کے ذریعہ اپنی عادتوں میں بہتری لانے کی کوشش کرتے رہنا چاہئے۔

یہاں اس سلسلہ میں مثالیں دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں خود ہی اندر میں غوطہ زنی کر کے، خود احتسابی سے کام لے کر، ہمت وحوصلہ سے منفی عادتوں سے جان چھڑا کر صحتمند عادتوں کے مزاج کو راسخ کرنے کی کاوش کرنی چاہئے۔ ذکر وصحبت کے نتیجہ میں فرد کے باطن میں جو روشنی پیدا ہوتی ہے، یہ روشنی عادتوں سے بچاؤ کے سلسلہ میں مؤثر کردار ادا کر سکتی ہے۔

توحید کے حوالے سے منفی عقائد اور اعمال کا بگاڑ جب مزاجوں کا حصہ بن جاتا ہے تو افراد قوم کی جو حالت ہوتی ہے، قرآن کی مختلف آیتوں میں اس کا بیان ہوا ہے۔ کچھ آیتیں پیش کی جاتی ہیں۔

ولو علم الله فيهم خير الاسمعهم ولو اسمعهم لتولوا وهم معرضون. (الانفال آیت ۲۳)

(اور اگر اللہ ان میں نیکی کا (مادہ) دیکھتا تو ان کو سننے کی توفیق بخشتا اور اگر بغیر (صلاحیت ہدایت کے) سماعت دیتا تو وہ منہ پھیر کر بھاگ جاتے)۔

وعلموا ان الله يحول بين المرء وقلبه. (سورہ انفال آیت ۲۴)

(اور جان لو کہ اللہ، فرد اور اس کے دل کے درمیاں حائل ہو جاتا ہے)۔

پہلی آیت کی تشریح میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ ''تفسیر عثمانی'' میں لکھتے ہیں:

''یعنی اصل یہ ہے کہ ان لوگوں میں بھلائی کی جڑ ہی نہیں، کیونکہ حقیقی بھلائی فرد کو اس وقت ملتی ہے، جب دل میں طلب حق کی سچی تڑپ اور نور ہدایت قبول کرنے کی لیاقت واستعداد موجود ہو، جو قوم طلب حق کی روح سے یکسر خالی ہو چکی ہو اور اس طرح خدا کی بخشی ہوئی قوتوں کو اپنے ہاتھوں ضایع کر چکی ہو، رفتہ رفتہ اس میں قبول حق کی لیاقت واستعداد بھی نہیں رہتی، اس کے دلوں میں خیر وہدایت کی لیاقت نہیں دیکھی، اگر ان میں کچھ بھی لیاقت دیکھتا تو اپنی عادت کے موافق ان کو ضرور اپنی آیتیں سنا کر سمجھا دیتا، باقی بحالت موجودہ اگر انہیں آیات سنا اور سمجھا دی جائیں تو یہ ضدی اور معاندین سمجھکر بھی تسلیم اور قبول کرنے والے نہیں۔ (تفسیر عثمانی، صفحہ ۲۳۸)

دوسری آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں:

''یعنی حکم بجالانے میں دیر نہ کرو، شاید تھوڑی دیر بعد دل ایسا نہ رہے، اپنے دل پر فرد کا قبضہ نہیں۔ بلکہ دل خدا کے ہاتھ میں ہے۔ جدھر چاہے پھیر دے، بیشک وہ اپنی رحمت سے کسی کا دل، ابتداءً نہیں روکتا، نہ اس پر مہر کرتا ہے، ہاں جب بندہ احکام کے عمل میں سستی اور کاہلی کرتا رہے تو اس کے جزا کے طور پر (دل کو) روک دیتا ہے۔ (صفحہ ۲۳۸)

واذ قال موسىٰ لقومه ياقوم لم تاذوننى وقد تعلمون انى رسول الله اليكم فلما زاغوا زاغ الله قلوبهم. (الصّف، آیت ۵)

(جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ مجھے کیوں ستاتے ہو، حالانکہ تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہاری طرف سے اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں، پھر جب وہ پھر گئے تو اللہ نے ان کے دل کو پھیر دیا)۔

اس کی تشریح میں مولانا عثمانیؒ صاحب لکھتے ہیں:

''بدی کرتے کرتے قائدہ ہے کہ دل سخت اور سیاہ ہوتا چلا جاتا ہے، حتیٰ کہ نیکی کی کوئی امید نہیں رہتی، یہی حال (اہل یہود) کا ہوا، جب ہر بات میں رسول سے ضد ہی کرتے رہے

اور برابر ٹیڑھی چال چلتے رہے تو آخر مردود ہوئے اور اللہ نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا کہ سیدھی بات قبول کرنے کی صلاحیت نہ رہی، ایسے ضدی نافرمانوں سے اللہ کی یہی عادت ہے۔ (صفحہ ۷۳۱)

کل بل ران علیٰ قلوبھم بما کانو یکسبون. (المطففین، آیت ۱۴)

(ہرگز نہیں بلکہ ان کے دلوں میں زنگ بیٹھ گیا ہے، ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے)۔

اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اصل یہ ہے کہ گناہوں کی کثرت ومزاولت سے ان کے دلوں پر زنگ چڑھ گئے ہیں، اس لئے صحیح حقائق کا انعکاس ان میں نہیں ہوتا، حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب کوئی شخص گناہ کرتا ہے تو ایک سیاہ نکتہ اس کے دل پر لگ جاتا ہے، اگر توبہ کر لی تو مٹ گیا، ورنہ جوں جوں گناہ کرتا جائے گا، وہ گناہ بڑھتا اور پھیلتا رہے گا تا آنکہ قلب بالکل کالا سیاہ ہوجائے کہ حق وباطل کی تمیز باقی نہ رہے۔ یہی حال ان مکذبین کا سمجھو کہ شرارتیں کرتے کرتے ان کے دل بالکل مسخ ہوچکے ہیں، اسی لئے وہ اللہ کا مذاق اڑاتے ہیں۔ (صفحہ ۷۸۲)

یہ ساری تفصیل اس لئے بیان کی گئی، تاکہ معلوم ہو کہ جب افکار، عقائد اور اعمال کا فساد عادتوں کی وجہ سے مزاج کا حصہ بن جاتا ہے، اور یہ عادتیں طاقتور ہوجاتی ہیں تو اللہ کا قانون حرکت میں آجاتا ہے، ہدایت اور حق کو اخذ کرنے کی صلاحیت ختم ہوجاتی ہے۔ اور نیکی کو اختیار کرنے کے لئے نئی پاکیزہ عادتوں کے راستے مسدود ہوجاتے ہیں۔

ماضی کی قوموں کا زوال اور تباہی ہو یا موجودہ قوموں کی فساد زدہ اور تباہ کن حالت ہو، ان سب کا بنیادی سبب فطرت سلیمہ کو مسخ کرکے، نفس پرستی پر مبنی طاقتور عادتوں کو مستحکم کرنا ہے۔

زندگی میں عادتوں کی اہمیت واثرات کے موضوع پر امریکہ کے ممتاز ماہر نفسیات اور فلاسفر ولیم جیمز نے اپنی کتاب اصول نفسیات (تین حصہ) میں تفصیلی بحث کی ہے ''اصول نفسیات'' کی پہلی جلد میں لکھتے ہیں۔

''مذہبی کتابوں میں جس جہنم کا ذکر ہے، شاید وہ جہنم اتنا سخت نہ ہو، جتنا وہ جہنم سخت ہے، جو ہم دنیا میں اپنی عادتوں اور زندگی کے رنگ ڈھنگ کو غلط رخ پر ڈال کر اختیار کرتے ہیں۔ جو شخص لگاتار توجہ، مضبوط ارادہ اور کوشش سے اپنے آپ کو غیر ضروری چیزوں سے بچالیتا ہے، وہ سخت سے سخت طوفان اور سیلاب کے موقع پر سخت چٹان کی طرح ہوتا ہے، جب کہ طوفان اور سیلاب میں کمزور لوگ اور سامان وغیرہ سب بہہ جاتا ہے، لیکن یہ مضبوط انسان، تن تنہا ان کے مقابلہ میں کھڑا ہوجاتا ہے۔ اسے طوفان نقصان پہنچائے بغیر گزر جاتا ہے، جس طرح فرد، بار بار شراب پینے سے شرابی بن جاتا ہے، اسی طرح اچھے اخلاق اختیار کرنے اور اخلاقی اوصاف سے مزین ہونے کے لیے روزانہ کوشش کرتے رہنے سے انسان فرشتہ صفت اور ولی بن جاتا ہے۔ اسی طرح علمی میدان میں محنت اور مشق کرنے سے آدمی عالم اور ماہر بن جاتا ہے۔

عادت کی وجہ سے دماغ میں کام کرنے کے خاص راستے بن جاتے ہیں۔ اور وہاں عام شکلیں اور صورتیں قائم ہوجاتی ہیں۔ یہ راستے آگے چل کر شاہراہوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، ذہن میں تعمیر ہونے والی ان شاہراہوں کو توڑ پھوڑ کر نئی راہیں بنانا کارے دارد ہے۔ ہم اگر اپنے جذبات کو بلاعمل کے ویسے ہی گزر جانے کا موقع دیں تو اندر میں بلاعمل کے جذبات کے منجمد ہونے کی عادت اور شکل پیدا ہوجاتی ہے۔ اگر چند بار بھی ایسا کیا گیا اور عمل سے گریز کیا گیا تو ایسی صورت پیدا ہوجاتی ہے کہ فرد کو اطلاع ہوئے بغیر، اس کے اندر سے عمل کی قابلیت اور صلاحیت ختم ہوجاتی ہے، اگر توجہ کو منتشر ہونے کا موقع دیا گیا تو وہ منتشر ہوجاتی ہے۔ توجہ اور کوشش ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ توجہ سے کوشش وجود میں آتی ہے۔ اور کوشش سے توجہ۔

انسان کے پاس چاہے اصولوں کا کتنا ہی بڑا خزانہ اور ذخیرہ کیوں نہ جمع ہو اور اس کا وجدان اور شعور کتنا ہی عمدہ کیوں نہ ہو، لیکن اگر عمل کے قیمتی مواقع ضایع کے گئے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھانے میں کاہلی سے کام لیا گیا ہے تو پھر فرد کی زندگی اور سیرت کی کبھی اصلاح نہ

ہو سکے گی۔ مثال مشہور ہے کہ عمل کے بغیر خالی نیک ارادے دوزخ کی طرف جاتے ہیں۔ جی ایس مل لکھتے ہیں: سیرت اصل میں ارادے کو مہذب بنانے کا نام ہے۔ ارادہ اصل میں زندگی کے سارے مواقع پر ایک خاص طریقے سے کام کرنے کا نام ہے۔ دنیا میں جو شخص عزیمت اور حوصلہ سے محروم ہے، اس سے زیادہ کوئی شخص قابل نفرت ہو نہیں سکتا۔ ایسا شخص اپنا وقت، جذبات اور احساسات کے فضول سمندر میں ضایع کرتا رہتا ہے اور وہ عملی طور پر کوئی کام سرانجام نہیں دے سکتا۔ اس کی مثال فرانس کے مشہور دانشور ''روسو'' کی سی ہے۔ روسو، فرانس کی عورتوں کو اپیل کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تم اپنے بچوں کی خود تربیت کرو اور ان کو لاوارثوں کی ہسپتال میں داخل نہ کرو۔ لیکن اس کی اپنی حالت یہ ہے کہ اس کی اولاد لاوارثوں کی ہسپتال میں داخل ہے۔ ہم میں سے ہر شخص جب نیک عمل کا ارادہ کرتا ہے، لیکن عمل کے مواقع اور مہلت کو ضایع کرتا ہے تو وہ گیا روسو کے نقش قدم پر چل رہا ہوتا ہے۔ زیادہ ناول پڑھنے اور فلمیں دیکھنے سے بے عمل قسم کے شیاطین ہی پیدا ہو سکتے ہیں۔

ایک روسی عورت کا واقعہ ہے کہ وہ تھیٹر میں نقلی اور فرضی لوگوں کی حالت زار دیکھ کر، ان کی مصیبت پر رو رہی تھی، جب کہ باہر اس کا کوچوان (ڈرائیور) سخت سردی سے ٹھٹھر کر مر رہا تھا، وہ اسے دیکھ رہی تھی، لیکن عمل کے مواقع ضایع کرنے کی عادت کی وجہ سے وہ اس کی مدد کو نہ آئی، بالآخر وہ مر گیا۔

اخلاقی عادات اور عقلی علوم کے درمیان فرق ہے۔ اخلاقی عادات میں (بدی اور خیر کی) دو قوتیں ایک دوسرے کے خلاف مصروف رہتی ہیں، ان میں سے ہر ایک دوسرے پر غالب آنا چاہتی ہیں۔ اس طرح کے مواقع پر جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ غلط رجحانات اور خراب اخلاق کو غالب آنے نہ دیا جائے، ایک خراب عادت کی مضبوطی اور کامیابی کئی اچھی عادتوں کے اثر کو برباد کر دیتی ہے۔ اس لیے یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ خیر اور شر کی ان قوتوں کے درمیاں ایسی صورت پیدا کی جائے کہ ہمیشہ (خیر) کی فتح ہوتی رہے۔ یہاں تک کہ اچھے کام کے بار بار کے تکرار سے خیر کی قوت اور عادت اتنی غالب ہو جائے کہ

شر کی قوت کمزور ہو جائے۔

جہاں تک ہو سکے، اپنے آپ کو روزمرہ کے کاموں کا عادی بنایا جائے، ایسے کام اور ایسی عادتیں جو نقصان دہ ہیں، ان سے اس طرح بچا جائے، جس طرح وبائی جراثیم سے بچا جاتا ہے۔ ہم اپنے اندر روزمرہ کاموں کی جتنی زیادہ عادت پیدا کریں گے، اسی قدر ذہن کی اعلیٰ (بالائی) قوتیں اپنا کام صحیح طور پر سرانجام دے سکیں گی۔ اس انسان سے زیادہ بدبخت انسان دوسرا کون ہو سکتا ہے کہ جسے اٹھتے بیٹھتے، سوتے، لیٹتے اور پانی پیتے، غرض کہ ہر کام کرتے وقت غور و فکر کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایسے شخص کا آدھے سے زیادہ وقت ایسی باتوں کے طے کرنے میں لگ جاتا ہے، جن کی اسے ایسی عادت ہونی چاہیے تھی کہ جیسے شعور کے لیے ان چیزوں کا وجود ہی نہیں۔ ڈیوک آف ولنگٹن کا کہنا ہے کہ ایک عادت میں اتنی قوت ہے کہ وہ دس طبیعتوں یعنی دس طبعی قوتوں کے برابر ہے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک پرانا سپاہی کھانا لے کر جا رہا تھا کہ ایک شخص نے اسے دیکھ کر یکدم اٹینشن کہا۔ اٹینشن سنتے ہی اس کے دونوں ہاتھ نیچے ہو گئے۔ اس طرح کھانا اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ سبب یہ تھا کہ اس نے ساری زندگی قواعد وضوابط کی پابندی کی تھی۔ قواعد کے اثرات اس کی طبیعت کا جزو بن گئے تھے۔ جو لوگ جیل میں ۲۵۔۲۵ سال بسر کرتے ہیں، وہ آزاد ہونے کے بعد بھی عمر کا باقی حصہ جیل میں گزارنے کی تمنا و آرزو کرتے ہیں۔

عادت کے طاقتور ہونے کی مثالیں دیتے ہوئے ولیم جیمس لکھتا ہے:

ایک تھیٹر کمپنی ریل میں سفر کر رہی تھی۔ اتفاق سے گاڑی پٹڑی سے نیچے اتر گئی۔ کمپنی کے پاس ایک شیر بھی تھا، جو ایک بڑے قفس میں بند تھا۔ پنجرہ کا دروازہ کھل گیا اور شیر باہر نکل آیا، لیکن وہ کسی کو نقصان پہنچائے بغیر از خود قفس میں داخل ہو گیا۔

عادت ایک ایسی چیز ہے، جو سوسائٹی کی حفاظت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے عادت ہی لوگوں کے ہر طبقہ کو انتظام اور قانون کے دائرے میں رکھتی ہے۔ اور اپنے اپنے میدان میں کام کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ یہ عادت ہی ہے، جس کی وجہ سے امیر اور سرمائیدار غریبوں کے

حاسدانہ حملوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ وہ لوگ جو ہوش سنبھالنے سے پہلے ورثے کے طور پر معیوب یا سخت پیشے اختیار کرتے ہیں، وہ عادت ہی ہے، جو ان کو ایسے پیشے اور ہنر اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ ملاح، جو سخت سردی کے موقع پر سمندر اور دریا میں مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ ہاری اور چرواہے، جو سخت برفباری کے موسم میں کھیت میں کام کرتے ہیں، وہ عادت ہی ہے جو ان سے ایسا کراتی ہے۔

یہ عادت ہی ہے، جو شہریوں کو پہاڑی، ریگستانی اور برفانی علاقوں میں رہنے والے لوگوں کے حملہ سے بچاتی ہے۔ عادت انسان کو مجبور کرتی ہے کہ جو پیشہ اس نے شروع سے اختیار کیا ہے، ساری زندگی اسی پیشہ میں بسر کرے، چاہے وہ پیشہ کتنا ہی معیوب اور غیر پسندیدہ کیو نہ ہو۔ کیوں کہ اس کے علاوہ وہ کسی دوسرے پیشہ کے لیے نہ تو مناسب ہوتے ہیں، نہ ہی دوسرا پیشہ شروع کرنے کے لیے وقت ہوتا ہے۔

۲۵ سال کی عمر سے پیشہ اور ہنر کی خاصیت غالب آنا شروع ہوجاتی ہے، جو پھر اس عمر سے طبیعت کا حصہ بن جاتی ہے، بالکل اس طرح جس طرح کوٹ کے کالر، کوٹ کا حصہ ہوتے ہیں۔ جن کو کوٹ سے ہرگز علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ تیس سال تک آتے آتے پیشہ کی عادت پلستر کی طرح پختہ بن جاتی ہے۔''

پرانی طاقتور عادتِ بد سے نجات کی صورت کیا ہے؟ اس پر بحث کرتے ہوئے ولیم جیمس لکھتا ہے:

''نئی عادت کو اختیار کرنے اور پرانی عادت کو چھوڑتے وقت حتی الامکان مضبوط ارادہ سے کام لینا چاہیے اور ذہن کی ساری طاقتوں کو استعمال کرنا چاہیے، تاکہ طبیعت میں نئی عادت شامل ہو سکے اور آہستہ آہستہ مزاج کا حصہ بنتی جائے، خود کو ہر وقت ایسے کاموں اور ایسی فکر میں مصروف رکھا جائے، جو نئی عادت کو مستحکم کرنے کا ذریعہ ثابت ہو، اگر مناسب سمجھو تو قسم کھا لو کہ میں فلاں خراب کام ہرگز نہ کروں گا۔ نہ اس کے قریب پھٹکوں گا۔ اور روزانہ فلاں فلاں اچھے کام ضرور کرتا رہوں گا، چاہے ان کاموں سے مجھے کتنی ہی تکلیف پہنچے اور طبیعت میں کیسا

ہی خلجان برپا ہو۔ طبیعت آمادہ ہو یا نہ ہو، ہر صورت میں نئی اچھی عادت کے تکرار کو جاری رکھنا چاہئے۔ ایسا کرنے سے معلوم ہوگا کہ ہر وہ دن، جو نئی عادت پر عمل پیرا ہونے میں گذرتا ہے، اس سے یہ عادت مزید مستحکم اور طاقتور ہوتی جائے گی، دوسری چیز، جو ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ جب تک نئی عادت مضبوط نہ ہو، تب تک اچھے عمل اور عادت میں معمولی کوتاہی اور ایک بار کی سستی اتنی نقصاندہ ہے، جتنا تاگے کا وہ ریل جو لپیٹنے والے سے گر جائے تو اس کو بہت سارا تاگہ ازسرِنو لپیٹنا پڑے گا۔ اس لیے کہ ایک مرتبہ گرنے سے اتنا تاگا کھل جاتا ہے کہ کئی مرتبہ کی کوشش کے بعد کہیں جا کر وہ مکمل ہوتا ہے، اس لئے جب تک نئے اچھے کام کی عادت مستحکم نہ ہو، تب تک اس کے ناغہ کی صورت نہ آنے دی جائے۔''

تکبر اور دعویٰ کی نفسیات

اور اس کی اصلاح کی راہ میں

حائل دشواریاں

وہ افراد، جو حکمرانی، افسری، سرداری، مالداری، دانشوری اور بڑے علمی منصب پر فائز ہوتے ہیں، عام طور پر ایسے افراد، نفسیاتی طور پر بڑے پن اور کبر کے غیر معمولی مرض میں مبتلا ہوتے ہیں، ان کی اصلاح آسان نہیں ہوتی، چونکہ حکمرانی، سرداری، مالداری اور علم کا زعم و کبر ونخوت وخود رائی سے ان کا دل سرشار ہوتا ہے، اس لئے اس طرح کے افراد کی اصلاح کے سلسلہ میں صحبت وذکر بھی ناکافی ثابت ہوتا ہے، اس لئے کہ تکبر ونخوت، صحبت، وذکر کے اثرات کو اندر داخل ہونے نہیں دیتی، اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایسے افراد اپنے رویے اور کردار سے اپنے بڑے ہونے اور ممتاز ہونے کا تاثر دیئے بغیر نہیں رہ سکتے، یہ نخوت اور تکبر ایسی بڑی بلا ہے، جو افراد کی ساری خوبیوں کو غارت کرنے کا موجب ثابت ہوتی ہے۔ ایسے افراد، زندگی بھر حقیقی اصلاح سے محروم رہتے ہیں۔ ان کی اصلاح کی صورت ایک ہی ہے، وہ یہ کہ وہ اپنا دل، اہل اللہ کے سپرد کریں، وہ ان کے لئے جو بھی مجاہدے تجویز کریں، وہ اس پر راضی ہو کر، اس مجاہدہ پر آمادہ ہوں۔

معاشرہ کو حکمرانوں، افسروں، سرداروں، مالداروں اور علم ودانش کے صاحبوں کے فاسد اثرات سے بچانے اور خود ان کو اپنی ذات کے لئے نافع بنانے کی یہی واحد صورت ہے۔

اللہ نے انسان میں کبر کی صورت میں فساد کا جو طاقتور داعیہ رکھا ہے اور اس داعیہ کو مال دولت اور سرداری وغیرہ جس طرح مزید طاقتور بنا کر خطرناک صورت دیتی ہے، اس کی فکرمندی نہ ہونے کی وجہ سے اکثر معاشرے فساد سے دوچار ہوتے ہیں۔ بڑے پن کے مرض

میں مبتلا افراد کی اصلاح کتنی مشکل ہے بزرگوں نے اپنی کتابوں میں اس کی مثالیں پیش کی ہیں۔

اس سلسلہ میں ہم یہاں امام غزالی کی کتاب احیاء العلوم حصہ چہارم سے ایک واقعہ بیان کرتے ہیں:

روایت ہے کہ اہل بسطام میں سے ایک خوبصورت اور مالدار شخص حضرت بایزید بسطامی کی مجلس میں حاضر باش تھا، وہ کبھی ان کی مجلس سے جدا نہیں ہوتا تھا، ایک دن اس شخص نے بایزید رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں تیس برس سے مسلسل روزے رکھ رہا ہوں، کبھی افطار نہیں کرتا، رات بھر نوافل پڑھتا ہوں، کبھی سوتا نہیں ہوں، مگر میرے دل میں اس علم کی معمولی سی خوشبو بھی اثر انداز نہیں ہوتی، جو آپ بیان کرتے ہیں، حالانکہ میں آپ کے بیان کردہ علم کی تصدیق کرتا ہوں، اور اس سے محبت کرتا ہوں، بایزید رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا، اگر تم تین سو برس تک دن میں روزے رکھتے رہو، اور رات کو نوافل پڑھتے رہو تو بھی تمہیں اس علم کا ایک ذرہ بھر حاصل نہ ہو سکے گا۔

اس شخص نے عرض کیا، کیوں! آپ نے فرمایا، اس لئے کہ تم اپنے نفس کی وجہ سے حجاب میں ہو، اس نے عرض کیا کہ اس کا کوئی علاج بھی ہے، فرمایا، ہاں: عرض کیا، مجھے بتایئے، تاکہ میں اس پر عمل کر سکوں، فرمایا، اس علاج پر تم عمل نہ کر سکو گے، اس نے عرض کیا، آپ بتائیں، میں ضرور عمل کروں گا، فرمایا، اسی وقت حجام کے پاس جاؤ، اپنا سر اور داڑھی منڈاؤ، یہ لباس اتار کر گدڑی پہنو، اور اپنے گلے میں اخروٹ سے لبریز جھولی لٹکا کر، بچوں سے کہو کہ وہ تمہیں ایک تھپڑ لگائیں، اور اس کے عوض ایک اخروٹ حاصل کر لیں، اپنا یہ حلیہ بنا کر بازاروں میں جاؤ، جہاں لوگوں کا ازدھام ہو، وہاں پہنچو، خاص طور پر ان لوگوں کے پاس ضرور جاؤ، جو تمہارے شناسا ہوں، اس نے کہا، سبحان اللہ! آپ مجھ سے ایسا کہتے ہیں، فرمایا، اس موقع پر تمہارا سبحان اللہ کہنا شرک ہے، اس نے عرض کیا، یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا، آپ کوئی اور عمل بتائیں، فرمایا، تمام تدبیروں سے پہلے اسی تدبیر پر عمل کرنا ہوگا، اس شخص نے کہا، میں

ایسا نہیں کرسکتا، فرمایا میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ جو علاج میں بتاؤں گا، وہ تم قبول نہیں کر پاؤ گے۔

حضرت بایزید بسطامی نے یہ علاج اس شخص کے لئے تجویز کیا ہے، جو صرف اپنے نفس کی طرف التفات رکھتا ہو، اور یہ چاہتا ہو کہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں، اس بیماری کا علاج اس کے علاوہ ممکن نہیں، جو حضرت بایزید نے تجویز کیا ہے، جو شخص اس علاج کی طاقت نہیں رکھتا، اس کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ ان لوگوں پر تنقید کرے، جو اس مرض میں مبتلا نہیں ہوئے یا ہوئے تو انہوں نے اس تدبیر سے اپنا مرض دور کیا، جو ابو یزید بسطامی نے بتلائی ہے، یا یہ ہے کہ اس مرض سے شفا پانا ممکن نہیں ہے، صحت کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ فرد اس کے امکان پر اعتقاد رکھتا ہو، جو شخص اس درجے سے بھی محروم ہے، اس کے لئے خرابی ہی خرابی ہے، شریعت میں یہ امور بالکل واضح طور پر بیان کے گئے ہیں، لیکن ان لوگوں پر مخفی رہ جاتے ہیں، جو اپنے آپ کو علمائے شریعت کے زمرے میں سمجھتے ہیں۔ (احیاء العلوم جلد چہارم، صفحہ نمبر ۵۲۴۔۵۲۵)

یہاں حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کا بیان کردہ واقعہ اور اس پر سیر حاصل تبصرہ بھی پیش کرنا ضروری ہے۔ لکھتے ہیں:

''لہٰذا جو عالم ظاہر ہو، اس کو اس بات کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے کہ وہ بلا چوں و چرا شیخ کی بات کو تسلیم کرے، اس لیے کہ علم کے اندر خود رفعت کی شان موجود ہے، لہٰذا جس شخص کو کوئی علم حاصل ہو جاتا ہے، اس کے اندر خود بخود ترفع اور بڑائی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ میرے اندر یہ کمال حاصل ہوا۔ اس لیے اکثر و بیشتر علم کے ساتھ تکبر آ ہی جاتا ہے، جب تک اس کی تربیت نہ ہو اور رگڑے نہ کھائے۔

میرے سب سے بڑے بھائی محمد ذکی کیفی رحمہ اللہ، مرحوم تھے، جو شاعر بھی تھے۔ بچپن میں انہوں نے دارالعلوم دیوبند میں کافیہ اور شرح جامی تک کتابیں پڑھی تھیں، اس کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا تھا، پھر تجارت وغیرہ میں لگ گئے، ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ بھائی

جان! آپ نے تعلیم مکمل کیوں نہیں کی تھی، درمیان میں کیوں چھوڑ دیا تھا؟ جواب میں فرمایا کہ بڑے میاں نے ہمارا معاملہ ختم کر دیا تھا۔ بڑے میاں سے مراد حضرت میاں سید اصغر حسین صاحب رحمہ اللہ، جو میاں صاحب کے نام سے مشہور تھے، اور صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے۔ میں نے پھر سوال کیا کہ کیا قصہ ہوا تھا؟ فرمانے لگے کہ ایک مرتبہ میں گھر سے دارالعلوم دیوبند پڑھنے کے لیے جا رہا تھا، راستے میں حضرت میاں صاحب کا مکان تھا، اور حضرت میاں صاحب گھر میں تشریف فرما تھے۔ ہمارے حضرت والد صاحب رحمہ اللہ کی تربیت کا یہ اثر تھا کہ یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ میاں صاحب کے گھر کے پاس سے گزریں اور میاں صاحب سے سلام کر کے اور دعا کرا کے نہ جائیں۔ میں نے سوچا کہ حضرت میاں صاحب موجود ہیں، چلو، ان سے سلام کر کے دعا کرالوں، پھر مدرسہ جاؤں۔ میاں صاحب اپنے پاس بادام وغیرہ بھی رکھا کرتے تھے، جب کوئی بچہ ان کے پاس ملاقات کے لئے آتا تو اس کو بادام وغیرہ بھی دیا کرتے تھے۔

بہرحال! میں ان کے پاس گیا اور جا کر سلام کیا، حضرت میاں صاحب نے جواب دیا، پھر میں نے دعا کی درخواست کی حضرت! میرے لیے دعا فرما دیجیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے علم عطا فرمادے، بڑے میاں نے جواب دیا، نا بھائی نا، علم بڑی خراب چیز ہے، میں تمہارے واسطے دعا نہیں کرتا۔ میں بڑا پریشان ہوا کہ یا اللہ، یہ فرما رہے ہیں کہ علم بڑی خراب چیز ہے۔ پھر اپنے بارے میں فرمانے لگے کہ میاں صاحب پہلے دارالعلوم میں مولسری کے درخت کے نیچے پھٹی پرانی چٹائی پر بیٹھا کرتا تھا، اور اب چوکی پر بیٹھ کر پڑھتا ہے، اور اب میاں صاحب سے کہو کہ نیچے بیٹھ کر پڑھا دو تو میاں صاحب کے مزاج میں فرق آ جاتا ہے، میاں! علم تو تکبر پیدا کرتا ہے، اس واسطے میں تمہارے واسطے علم کی دعا نہیں کرتا۔ بھائی جان کہتے ہیں کہ مجھے اسی دن خطرہ ہو گیا تھا کہ بڑے میاں نے ہمارا تو پتہ صاف کر دیا، اب یہ علم پورا ہونے والا نہیں۔ بہرحال! وہ تو صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے، اللہ تعالیٰ نے ان پر منکشف فرمایا ہوگا کہ اس علم کی تکمیل ان کے حق میں مقدر نہیں ہے، اس لیے مناسب طریقے سے بچے کو بتا دیا۔

لیکن بات جو ارشاد فرمائی، وہ یہ تھی کہ علم تکبر پیدا کرتا ہے، لہٰذا اگر علم کی وجہ سے تکبر پیدا ہوگیا، تو پھر اس علم سے ہزار درجہ بہتر یہ تھا کہ آدمی جاہل رہتا، اور ایک ان پڑھ دیہاتی کی طرح زندگی گزارتا تو کم از کم اللہ تعالیٰ کے یہاں جا کر علم کے اس تکبر اور بڑائی کا عذاب نہ ہوتا۔ اس لیے علم کے ساتھ اکثر و بیشتر یہ چیز جمع ہوجاتی ہے اور اس کا حل اس کے علاوہ کوئی اور نہیں کہ اپنی لگام کسی کے حوالے کرے، وہ یہ دیکھے کہ کیا بیماریاں اس کے اندر پیدا ہورہی ہیں اور جو بیماریاں پیدا ہورہی ہیں، ان کا علاج کرے۔

ہمارے حضرت والد صاحب رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ علم دودھاری تلوار ہے، اگر اللہ تعالیٰ اس علم میں نور عطا فرمادے، اس میں برکت عطا فرمادے اور اس کو نافع بنادے تو پھر سبحان اللہ، یہ علم کیا عجیب وغریب چیز ہے۔ لیکن اگر خدانخواستہ اس علم میں نور اور برکت نہ ہو، اس میں نافعیت نہ ہو، اور یہ انسان کو کبر اور گھمنڈ میں مبتلا کردے تو پھر اس علم سے زیادہ مہلک چیز بھی کوئی نہیں ہے۔ حضرت والد صاحب رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ جتنی مرغن اور شاندار اور مزیدار غذا ہوتی ہے، سڑنے کے بعد وہ اتنی ہی زیادہ بدبودار بن جاتی ہے، اگر معمولی غذا ہے، جس میں روغن نہیں ہے، اس کے سڑنے سے تھوڑی بہت بدبو پیدا ہوگی، لیکن مرغن غذا سڑنے کے بعد سارے محلے کو متعفن کردے گی، اسی طرح جتنے اونچے سے انسان گرتا ہے، اتنی ہی چوٹ زیادہ لگتی ہے، اسی طرح یہ علم اگرچہ اعلیٰ درجے کی چیز ہے، لیکن اگر یہ خراب ہوجائے اور انسان کو تکبر اور گھمنڈ میں مبتلا کرے دے تو یہ علم انسان کے لیے اتنا ہی مہلک ہے۔ اس لیے خاص طور پر عالم کو اس بات کی زیادہ ضرورت ہے کہ وہ کسی سے اپنی اصلاح کرائے۔

میں نے اپنے والد ماجد قدس اللہ سرہ سے سنا کہ کسی شخص نے خواب میں شیطان کو دیکھا کہ وہ بہت ساری گٹھریاں اپنی کمر پر اٹھائے لے جارہا ہے، جیسے بنجارہ ایک شہر سے دوسرے شہر سامان اٹھا کر لے جاتا ہے اور بیچتا ہے، اسی طرح وہ بھی سامان لے جارہا ہے، اب گٹھریوں کو دیکھا تو کسی گٹھری میں پاخانہ بھرا ہوا ہے، کسی میں لید، کسی میں گوبر، اور کسی میں

پیشاب بھرا ہوا ہے، اس نے شیطان سے پوچھا کہ یہ سب کیا ہے؟ شیطان نے ایک گٹھری کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ تکبر ہے، دوسری گٹھری کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ حب جاہ ہے، کسی کی طرف اشارہ کر کے کہا، یہ حسد ہے وغیرہ، لیکن یہ سب چیزیں نجاستوں کی شکل میں تھیں۔ ان صاحب نے پھر شیطان سے پوچھا کہ ان کو کہاں لے جارہے ہو؟ شیطان نے جواب دیا کہ ان کو لے جا کر فروخت کروں گا۔ ان صاحب نے پھر پوچھا کہ پیسے دے کر تجھ سے یہ نجاستیں کون خریدے گا؟ شیطان نے جواب دیا کہ اپنے مال کی منڈی میں جانتا ہوں، اور اس کے گاہک اور خریداروں کو بھی جانتا ہوں، یہ ''تکبر'' اور ''حب جاہ'' یہ دو نجاستیں میں مولویوں کے پاس جا کر بیچوں گا، وہ ان دونوں کے بڑے شوقین ہیں، ان کو ان دونوں کے کھانے میں بڑا مزہ آتا ہے، حب جاہ کا کیا مطلب ہے؟ حب جاہ کی معنیٰ ہیں شہرت کہ لوگ میرے آگے جھکیں، لوگ میرے معتقد بنیں، لوگ میری تعریف کریں، میری شہرت ہو، یہ سب حب جاہ ہے۔ حب جاہ کو بیچنے کی سب سے بہترین منڈی مولوی صاحبان ہیں۔ وہاں جا کر اس کو بیچوں گا وہ خوب مزے لے کر اس کو کھائیں گے۔

بہرحال! یہ علم ایک تو بذات خود فی نفسہ طالب علو ہے، اس لیے صاحب علم کے اندر تکبر پیدا کرتا ہے، دوسری آفت اس علم میں یہ ہے کہ لوگ حامل علم دین کی عزت کرتے ہیں، کوئی اس کے ہاتھ چوم رہا ہے، کوئی اس کے پاؤں چوم رہا ہے، کوئی اس کے لیے عزت سے کھڑا ہورہا ہے، کوئی اس کے لیے ہدیہ لارہا ہے، کوئی دعوت کررہا ہے، ان افعال کے نتیجے میں وہ حامل علم اپنے بارے میں یہ سمجھنے لگتا ہے کہ ہم بھی کچھ ہیں، یہ اتنی ساری مخلوق جو ہماری عزت کررہی ہے، ہمارے پیچھے پھر رہی ہے، آخر کچھ تو ہمارے اندر کمال ہوگا۔

چنانچہ اہل علم کی ایک مثال دیتے ہوئے حضرت تھانویؒ نے لکھا ہے کہ ایک بہت لالچی انسان تھا۔ ایک مرتبہ راستے سے گزر رہا تھا، بچے اس کو چھیڑنے کے لیے اس کے پیچھے لگ گئے۔ ان بچوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے اس نے بچوں سے کہا کہ تم یہاں کیا کررہے ہو، فلاں جگہ جاؤ، وہاں مٹھائی تقسیم ہورہی ہے، چنانچہ بچے اس طرف بھاگے تو خود بھی بچوں کے

پیچھے بھاگنے لگا، لوگوں نے پوچھا کہ تم کیوں بھاگ رہے ہو؟ اس نے کہا کہ سب بچے بھاگ رہے ہیں تو ضرور مٹھائی تقسیم ہورہی ہوگی۔ ہماری مثال بھی ایسی ہے کہ پہلے اپنے علم کے ذریعے مخلوق کو دھوکہ دیا، اس دھوکے دینے کے نتیجے میں جب مخلوق ہماری معتقد ہوگئی، اب کوئی ہاتھ چوم رہا ہے، کوئی دعوت کررہا ہے، کوئی ہدیہ لارہا ہے، کوئی علامہ کا لقب دے رہا ہے، تو اب دماغ میں یہ خیال آیا کہ جب اتنی ساری مخلوق ہمارے پیچھے چل رہی ہے اور ہماری معتقد ہورہی ہے تو ہمارے اندر ضرور کوئی وصف ہوگا، جس کی وجہ سے یہ ساری مخلوق ہماری معتقد ہورہی ہے۔

زبان خلق کا نقارۂ خدا سمجھو

اس کے نتیجے میں وہ عالم اور زیادہ تکبر میں مبتلا ہوجاتا ہے۔'' (حضرت مفتی صاحب کے ایک مضمون سے ماخوذ)

بندہ مؤمن کے لئے دستور العمل

عہد جدید کے پس منظر میں

(۱) حالات کیسے بھی ہوں، اذان سنتے ہی نماز کی تیاری شروع کردینی چاہئے۔

(۲) روزانہ قرآن کی تلاوت کا معمول ہونا چاہئے یا قرآن سننے کا اہتمام ہونا چاہئے، اس میں سستی سے کام نہ لینا چاہئے۔

(۳) روزانہ ذکر وفکر کے لئے ضرور وقت نکالنا چاہئے، گھر سے نکلنے سے پہلے ذکر کا معمول ہونا ضروری ہے۔

(۴) دن بھر کے اوقات کے استعمال کا حساب کتاب کرنا چاہئے، یعنی اس سلسلہ میں خود احتسابی سے کام لینا چاہئے کہ میرا وقت فضول اور غیر ضروری کاموں میں تو صرف نہیں ہوا۔

(۵) معاملہ کتنا ہی اہم ہو، بحث ومباحثہ سے بچنا چاہئے، اس لئے کہ مباحثہ سے نہ تو فائدہ ہوتا ہے اور نہ ہی اس سے کسی نتیجہ پر پہنچا جاسکتا ہے۔

(۶) زیادہ ہنسنے سے پرہیز کرنا چاہئے، جو دل اللہ میں مصروف ہوتا ہے وہ زیادہ ہنسی مذاق سے محفوظ ہوتا ہے۔

(۷) گفتگو میں سننے والے افراد کی سماعت کی صلاحیت سے زیادہ آواز بلند نہ کرنا چاہئے، ایسا کرنے سے اپنی بات ہر صورت میں منانے کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔

(۸) زندگی کے ہر معاملہ میں سنجیدگی اختیار کرنی چاہے، سنجیدگی بصیرت کی نشانی ہے۔

(۹) لوگوں کی غیبت سے بچنا چاہئے اور جماعتوں کے خلاف لعن طعن ہرگز نہ کرنا چاہئے۔

(۱۰) فرد کی زبان سے خیر کے سوا کوئی گفتگو نہ نکلنا چاہئے۔

(۱۱) ہر فرد سے ملاقات کے وقت سرگرمی اور والہانہ پن سے ملنا چاہئے، ملتے وقت الفت اور محبت کا مظاہرہ ہونا چاہئے، تاکہ مانوسیت اور اپنائیت کی فضا پیدا ہو سکے۔

(۱۲) اپنی صحت کا خاص خیال رکھنا چاہئے، اس لئے کہ عبادت اور دین کے سارے کاموں کا تعلق صحت سے ہے، صحت کے بغیر یہ سارے کام متاثر ہوتے ہیں۔

(۱۳) روزانہ تفریح کے لئے صبح وشام ضرور وقت نکالنا چاہئے۔

(۱۴) طلب کے بغیر مشورہ نہ دینا چاہئے، اس لئے کہ اس صورت میں مشورہ کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔

(۱۵) افراد کو اصلاح کی دعوت دینے سے پہلے اس کے لئے ذہنی ونفسیاتی فضا پیدا کرنی چاہئے۔

(۱۶) زندگی کی مشکلات اور پریشانیوں سے مایوس نہ ہونا چاہئے، پریشانی کے موقعہ پر اللہ کے ذکر کا سہارا لینا چاہئے۔ ذکر سے دل مستحکم ہوتا ہے اور مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

(۱۷) روزانہ آخرت کی زندگی، حساب کتاب کی سختیوں، ساری مخلوق کے سامنے جواب دہی کا مراقبہ کرنا چاہئے، اس سے آخرت کی تیاری کی فکرمندی غالب ہوگی۔

(۱۸) کثرت ذکر کے ذریعہ اپنے اندر اتنی خوداعتمادی پیدا کرنی چاہئے کہ معاشرہ سے متاثر ہونے کی بجائے، معاشرہ کو خود اپنے کردار سے متاثر کرنا چاہئے اور ان کی معاشرتی وعملی زندگی میں تبدیلی پیدا کرنے کا ذریعہ ہونا چاہئے۔

(۱۹) خوشی وغمی کے حالات میں معاشرہ کی فاسد روایات کو توڑنے کا حوصلہ پیدا کرنا چاہئے، نہ کہ معاشرہ کی روایات کا حصہ ہونا چاہئے۔

(۲۰) ضروریات کو بڑھانے سے بچنا چاہئے، بچے ہوئے وقت کو عبادت، ذکر وفکر، دعوت اور خدمت کے کاموں میں صرف کرنا چاہئے۔

(۲۱) معاش کے لئے آٹھ گھنٹوں سے زیادہ وقت خرچ نہ کرنا چاہئے، آٹھ گھنٹوں میں جو کچھ حاصل ہو، اس پر قناعت کی عادت ڈالنی چاہئے۔

(۲۲) مزاج کے خلاف باتوں اور رویوں کو برداشت کر کے فضا میں خوشگواری پیدا کرنی چاہئے۔

(۲۳) وقت کو سب سے بڑی دولت سمجھکر، اس کے صحیح استعمال کی فکرمندی ہونی چاہئے۔

(۲۴) اہل خانہ کی اصلاح کے لئے سختی کے بجائے صبر، حکمت، مستعدی اور غیر معمولی فکرمندی سے کام لینا چاہئے۔

(۲۵) فرد کو معاشرہ میں چھوٹا بن کر رہنے کا سلیقہ سیکھنا چاہئے، جس کی علامتوں میں ادب وآداب کی بجا آوری، بڑوں کی تکریم، چھوٹوں سے شفقت، اور ضد سے بچاؤ جیسی چیزیں شامل ہیں۔

(۲۶) اندر کے مفتی کو بیدار سے بیدار تر کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، تاکہ زندگی کے معاملات میں نفسی خرابیوں اور اعمال کی صحت وعدم صحت، اخلاص وعدم اخلاص کے سلسلہ میں اس کی فتویٰ کا عمل جاری رہ سکے، بلکہ تیز تر ہو سکے۔

(۲۷) ذکر کے مزاج کو راسخ کرنے کی کوشش ہونی چاہئے، تاکہ نفسی قوتوں کی یرغمالی سے پوری طرح بچاؤ کی صورت پیدا ہو سکے۔

(۲۸) صالحین کی صحبت کے ماحول میں رہنے کا پابند ہونا چاہئے، ضروریات زندگی کے حصول کی خاطر اگر ان سے جدائی بھی ہو جائے تو وقت ملتے ہی بلا تاخیر ان کی صحبت اور ان سے رابطہ کی کوشش ہونی چاہئے، اس لئے کہ نفس پرستی کی قوتوں اور مادیت سے بچاؤ کے سلسلہ میں ان کی صحبت سب سے طاقتور ہتھیار کی حیثیت رکھتی ہے۔

(۲۹) جدید دور کے ان فتنوں سے واقف ہونا چاہئے، جن کا معاشرہ میں چلن ہو، اور جن کی وجہ سے افراد کی ذہنی، علمی اور عملی بگاڑ کی صورت پیدا ہوتی ہو۔

(۳۰) معاشرہ میں پیدا شدہ مسلکی اور گروہی دائروں اوران جھگڑوں سے دور رہنا چاہئے۔

(۳۱) روزانہ بزرگان دین کی کتابوں کا کچھ نہ کچھ مطالعہ ضرور کرنا چاہئے، اس سے روزمرہ پیش آنے والے حالات ومسائل میں رہنمائی کی صورت پیدا ہوتی چلی جائے گی۔

(۳۲) مالداروں کی صحبت سے ہرصورت میں بچتے رہنا چاہئے، اس لئے کہ مال و دولت کی وجہ سے ان کی شخصیت، افراد کو اپنی طرف کھینچنے اور حب دنیا کی راہ پر گامزن کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے، البتہ حب جاہ وحب مال سے محفوظ مالدار، مالدارنہیں ہیں وہ دل کے فقیر ہیں۔اگرچہ معاشرہ میں ایسے افراد نایاب ہیں۔

(۳۳) احکام شریعت کی خلاف ورزی سے بچنا چاہئے، اس لئے کہ اس کے وبال سے فرد کے لئے شر کے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں اور خیر کے راستے مسدود ہوتے چلے جاتے ہیں، اگر بشری تقاضے کی وجہ سے خلاف شرع کام ہوجائے تو توبہ میں تاخیر نہ کرنا چاہئے۔

(۳۴) مالداروں کو دیکھکر ان جیسا بننے کی حسرت وارمان سے بچنا چاہئے، اس لئے کہ اس طرح حسرت کے نتیجہ میں آخرت کی فکر اور آخرت کے اعمال کے سلسلہ میں قلب میں حجابات پیدا ہوجانے کے خطرات لاحق ہوتے ہیں۔

(۳۵) معاشی پریشانی لاحق ہوجائے تو لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی بجائے، اللہ سے مانگنا چاہئے، اس لئے کہ مالدار خودمحتاج ہیں۔ جو خودمحتاج ہو، وہ دوسروں کی احتیاج کس طرح پوری کرسکتا ہے۔ مالداروں کی مال کی محتاجی تو غریبوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ان کا دل، دولت میں اٹکا ہوا ہوتا ہے، ان کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے ہرممکن حد تک بچنا چاہئے۔

(۳۶) زندگی برف کی طرح پگھلتی جارہی ہے۔ شب و روز اس طرح گزر رہے ہیں، جیسے چند لمحات ہوں، ایسی ناپائدار زندگی کے مستقبل کو فیصلہ کن اہمیت دے کر، اس

میں ساری توانائیاں صرف کرنا نادانی ہے، نادانی۔ نادانی کی اس روش سے اوپر اٹھنے کی کوشش کرنا چاہئے اور دائمی زندگی کی فکر غالب ہونی چاہئے۔

(۳۷) اپنے بچوں کی معاشی فکر اور اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کی فکر سے زیادہ انہیں آخرت کے عذاب سے بچانے کی فکر دامنگیر ہونی چاہئے اور یہی دانائی کی بڑی علامت ہے۔

(۳۸) معاشی جدوجہد بھی ناگزیر ہے تاکہ لوگوں کی محتاجی سے بچا جاسکے تاکہ بچوں میں احساس کمتری پیدا نہ ہو۔

(۳۹) انسان کی تخلیق کا مقصد عبادت ہے، شروع میں عبادت اور ذکر وفکر کے لئے زیادہ وقت نکالنا پڑتا ہے۔ جب ذکر وفکر کا ملکہ راسخ ہوجاتا ہے تو سارے اعمال بجائے خود عبادت ہوجاتے ہیں۔اس لئے کہ عبادت اور ذکر وفکر کے ملکہ سے اخلاص وللھیت کا رنگ غالب ہوجاتا ہے۔

(۴۰) زیادہ آمدنی کے حامل افراد کو معاشرہ میں موجود محتاجوں اور غریبوں کے لئے ماہانہ بنیادوں پر اپنی آمدنی کا کچھ مخصوص حصہ ضرور صرف کرنا چاہئے، آمدنی کا یہ حصہ بیس فیصد ضرور ہونا چاہئے۔موجودہ دور میں جب کہ لوگ بھوکوں مر رہے ہیں۔علاج کی رقم نہ ہونے کی وجہ سے تڑپ رہے ہیں، غربت کے ان حالات میں ایسا نہ کرنا سنگ دلی ہے۔سنگ دلی، ایسے افراد کو وہ حدیث رسول پیش نظر رکھنی چاہئے، جس میں آپ ﷺ نے فرمایا، خدا کی قسم، تم میں سے کوئی شخص (کامل) مؤمن نہیں ہوسکتا، جب تک اپنے لئے جو کچھ چاہتا ہے، وہی کچھ اپنے دوسرے (مؤمن) بھائی کے لئے نہ چاہے۔ایمان کی ارتقا کا یہ لازمی نتیجہ ہونا چاہئے کہ دوسروں کی حالت محتاجی دیکھکر فرد تڑپ جائے۔

(۴۱) فرد کی شخصیت کا سارا استحکام اس بات سے وابستہ ہے کہ وہ باطن میں موجود نفسی قوتوں کی گرفت سے آزادی حاصل کرے، شعور کی صحیح خطوط پر تربیت کا اہتمام کرے اور روح کو لطیف سے لطیف تر بنانے کی کاوش کرے۔

اس کی انسانیت اور سارے انسانی جوہروں سے بہرہ وری کا تعلق اسی جدوجہد سے

وابستہ ہے، جب تک وہ اس جدوجہد میں ایک حد تک کامیاب نہیں ہوتا، اس کی شخصیت شکست وریخت سے دوچار رہے گی اور مادیت، مادی قوتوں اور نفس کے برپا کردہ طوفانوں کے زیراثر زیروزبر رہے گی۔

نفسی اور رحمانی قوتوں کے درمیاں صبر آزما جنگ کے بغیر فرد کی شخصیت میں استحکام پیدا ہو سکے، وہ افراد معاشرہ کے لئے قیمتی انسان بن سکے، اسلامی شریعت کی راہ اس کے لئے آسان ہو سکے، دشوار تر ہے۔ نفس اور مادیت کے خلاف یہ معرکہ صالحین کی مسلسل صحبت، اور کثرت ذکر کے ذریعہ ہی طے ہوتا ہے اور اب تک طے ہوتا آیا ہے۔

(۴۲) فرد کو شیطان کی طرف سے یہ القا کیا جاتا ہے کہ ذکر وفکر، عبادت اور خدمت دین کے کاموں میں مصروفیت سے، اس کی جدوجہد متاثر ہوگی اور وہ معاشی زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائے گا، نیز اس کی معاشی زندگی تنگ ہوجائے گی، طالب کو اس شیطانی القا کو پوری شدت سے مسترد کرنا چاہئے، اس لئے کہ جو فرد اللہ کے کاموں میں مصروف ہوجاتا ہے، اللہ اس کا ہوجاتا ہے۔ اور جس کا اللہ ہوجائے، اسے کس چیز کا ڈر اور کس چیز کی فکر۔ اس طرح کے مواقع پر فرد کو "**ان تنصر الله ینصرکم**" جیسی دسیوں قرآنی آیات کا استحضار کرنا چاہئے۔ بلکہ ان آیتوں کا مراقبہ کرنا چاہئے۔ اللہ، طالب کو دوسروں کے رحم وکرم پر ہرگز نہیں چھوڑتا۔

(۴۳) وقت کی پابندی ضروری ہے، شادی وغمی میں، اصلاحی پروگراموں کی شرکت میں، ملاقات کے وقت طے کرنے وغیرہ میں وقت کی پابندی ہماری تہذیب کا حصہ رہی ہے۔

میں نے اگر کسی سے ملاقات کا وقت لیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اسے پابند کیا ہے کہ وہ سارے کاموں کو اوپر نیچے کرکے، میرے لئے وقت کو فارغ کردے، اگر میں وعدہ کرکے وقت مقررہ پر نہ پہنچا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اس کا قیمتی وقت ضائع کیا، اس کے دوسرے کاموں اور پروگراموں کو متاثر کیا، اور اسے ذہنی اذیت پہنچائی۔

وقت کی پابندی ایک اعتبار سے شخصیت کے جانچنے کا پیمانہ بھی ہے کہ فرد کے مزاج میں وقت کے صحیح استعمال کے سلسلہ میں سنجیدگی کا عنصر کس حد تک موجود ہے۔

علمی، دعوتی واصلاحی پروگراموں میں وقت کی پابندی سے شرکت نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ میں اس پروگرام کے ایک اہم حصہ کے فوائد وثمرات سے محروم رہا۔

وقت کی پابندی فرد کے سنجیدہ مزاج اور عدم پابندی اس کے لاابالی مزاج کی نشاندہی بھی کرتا ہے، اس لئے اس کا خصوصی اہتمام ہونا ضروری ہے۔

(۴۴) دین کی مظلومیت کے دور میں اپنی صلاحیتوں کے مطابق دین کی نصرت کا کام کرنا، یہ کام ایسا ہے جو فرد وافراد کے درجات کو بلند کرنے اور خود روحانی ارتقا کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔ لیکن مبتدی کو اس کام سے زیادہ اپنی اصلاح کی فکر کرنی چاہئے، البتہ متوسط فرد کو اس کی فکر کرنی چاہئے اور اس کے لئے وقت نکالنا چاہئے۔ منتہی فرد کی جدوجہد کا اصل ہدف یہی ہوتا ہے کہ وہ بیشتر توانائیاں دوسروں کی اصلاح وتربیت اور خدمت دین اور دعوت دین میں صرف کردیتا ہے اور خدمت خلق کو وظیفہ بناتا ہے۔

(۴۵) موجودہ دور میں مغربی تہذیب، مغربی تعلیم اور میڈیا کے زیر اثر ملحدانہ نظریات اور سیکولر طرز فکر تیزی سے بڑھتا جا رہا ہے۔ اور ہماری نسلوں کا دین کے بنیادی عقائد پر تک اعتماد متزلزل ہورہا ہے۔ خدا، رسول اور دین کی بنیادی تعلیمات تک اعتراضات کی نفسیات پیدا ہوتی جارہی ہے، اندرون سندھ کے تعلیمی اداروں میں ملحد اور سیکولر اساتذہ اور قوم پرست تنظیموں کے زیر اثر یہ رجحانات تیزی سے بڑھتے جارہے ہیں۔ اور ذہین طلبہ کو نشانہ بنا کر ان کو لٹریچر، گفتگو اور مجلسوں میں شرکت کے ذریعہ ملحدانہ فکر ہضم کرائی جارہی ہے۔ ہندی تہذیب کے لئے بھی فضا ہموار کی جارہی ہے۔ اسلام کے خلاف جارحانہ مزاج پیدا کیا جارہا ہے۔

ان حالات میں دردمند افراد کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ وہ اس محاذ پر جتنا بھی کام کریں، کم ہے، موجودہ حالات میں یہ سب سے بڑا جہاد ہے۔ اس نکتہ کو سمجھنے کی

ضرورت ہے۔ اس محاذ پر کام نہ کرنے کے نتیجہ میں خطرہ ہے کہ کہیں سندھ مستقبل میں سیکولرزم کی نئی تجربہ گاہ نہ بن جائے، اس لئے کہ سندھ میں جس بڑے پیمانہ پر اہل علم ان کے زیر اثر سارے متوسط طبقات سیکولرازم کے زیر اثر آ گئے ہیں وہ بہت خطرے کی بات ہے۔

(۴۶) انسانی شخصیت میں سب سے زیادہ فیصلہ کن اہمیت دل کو حاصل ہے، دل کے بعد، عقل بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ ان دونوں کے درمیاں توازن کی ضرورت ہے، موجودہ دور عقل وعقلیت کا دور ہے، فکر، فلسفہ اور نظریات کا دور ہے۔

نظریات بیشتر نفس کی یرغمالی کے نتیجہ میں پیدا ہوئے ہیں، ان نظریات نے مادی فلسفہ حیات کی حیثیت اختیار کر لی ہے، انہی نظریات کی بنیاد پر عالمی سطح کی مادی تہذیب وجود میں آئی ہے۔

سائنسی ترقی اور ٹیکنالوجی نے اس مادی تہذیب کو انسانیت پر حاوی ہونے کا موقعہ فراہم کیا ہے، اس مادی تہذیب کی نظریاتی بنیادیں ایسی ہیں، جس نے عالم اسلام کے جدید تعلیم یافتہ افراد کو بُری طرح متاثر کیا ہے، ہماری نسلیں بھی ان مادی نظریات کی زد میں ہیں، اس کی وجہ سے اسلام پر ان کا اعتماد مجروح ہوگیا ہے، ضرورت ہے کہ ہم اپنی ذہین وباصلاحیت نسلوں کو عقلی استدلال کے ذریعہ ان کو نظریات کے سحر سے نکالیں اور اسلام کے نظریہ حیات پر ان کے اعتماد کو بحال کریں، یہ اس دور میں دین کی بہت بڑی خدمت ہے، جس کا ہمیں پوری طرح ادراک ہونا چاہئے اور اس سلسلہ میں بھرپور کردار ادا کرنا چاہئے۔

(۴۷) موجودہ دور میں دفتری ماحول، کاروباری ماحول، صنعتی ماحول، سروس کا ماحول یہ رشوت، خیانت، جھوٹ، سود، لوٹ مار، دولت پرستی، حب جاہ وحب مال کے مظاہر کی وجہ سے ظلمات وسیاہی سے بھرپور ماحول ہے، اس ماحول میں رہنے اور کام کرنے سے ایمانی قوت کمزور سے کمزور ہوتی ہے۔ فرد صبح کو بہتر ایمانی حالت کے ساتھ دفتر جاتا ہے، شام کو وہ ظلمات وسیاہی کے غیر معمولی اثرات اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اس طرح کی

صورتحال میں اسم ذات کے قلبی ذکر کی مشقوں سے فرد کے ایمان کی بہتر سے بہتر حفاظت کی صورت پیدا ہوسکتی ہے۔

دفتر یا کاروبار کی مصروفیت سے تھوڑا بھی فارغ وقت ملے، فرد اسم ذات کے ذکر میں مشغول ہوجائے، اس سے اس کے لئے تاریکی کے ماحول سے نکلنے اور ایمان کی حفاظت وسلامتی کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن ہمت، حوصلے اور مستعدی سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

صبح وشام کے روزانہ ذکر کے معمولات میں استقامت کے مظاہرہ سے ذکر کی اس استعداد میں اضافہ ہوتا جائے گا اور ''دست بکار دل بیار'' کی حالت آہستہ آہستہ پیدا ہوتی جائے گی۔

(۴۸) اللہ کے ہاں اعمال کی قدر وقیمت اور ان کا وزن جذبہ اخلاص سے ہی وابستہ ہے۔ اعمال میں اگر اخلاص موجود نہیں ہے تو اعمال کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے۔ اخلاص، للھیت، بے نفسی وبے غرضی پیدا کرنے کے کام کو اہمیت دینی چاہئے۔ اخلاص، دل کی صلاحیتوں کو بیدار کرتے رہنے، خود احتسابی سے کام لیتے رہنے اور صاحبان دل سے تعلق مستحکم کرنے کے نتیجہ میں پیدا ہوتا اور ارتقا پذیر ہوتا ہے۔

(۴۹) دوسروں کی تحقیر کرنے یا انہیں حقیر کرنے اور ان کی تذلیل کرنے سے بچنے کا خصوصی اہتمام کرنا چاہئے، نفس کی چاہت یہی ہوتی ہے کہ معاشرہ میں بس اسی کا نام ہو، بلکہ اس کی الوہیت قائم ہو، اس کی انا کے مقابلہ میں سب کی انانیتیں حالت شکست میں ہوں۔ نفس لعین اس سے کم پر تیار نہیں۔

نفس کی یہ چاہت ایسی خطرناک ہے کہ اس کی وجہ سے فرد کو گرا دیا جاتا ہے اور اس سے حقیقی خیر وصلاح کی سعادتیں سلب کردی جاتی ہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ محتاط ہونے اور ڈرتے رہنے کی ضرورت ہے۔ نفس سے الوہیت کا یہ مادہ اہل اللہ کی صحبت اور کثرت ذکر کے بغیر مضمحل ہوجائے، انتہائی دشوار

تر ہے۔ سنبھلنے اور بیدار ہونے کی ضرورت ہے۔

(۵۰) خدمت دین اور خدمت خلق یہ دو کام ایسے ہیں کہ ان کاموں کو جاری رکھنے کے نتیجہ میں فرد اللہ کے فضل خاص کا مستحق ہونے لگتا ہے، ایسے افراد کے لئے سعادتوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ ان کاموں میں اخلاص، للھیت اور عاجزی کے اجزاء موجود ہوں، ان کاموں میں نفسانیت اور نفسانی مقاصد موجود نہ ہوں۔

(۵۱) طالب کو چاہئے کہ صبح کو کام کے لئے گھر سے نکلنے سے پہلے آدھے سے ایک گھنٹہ تک کا ذکر کر کے نکلے، دوسری صورت میں وہ سارا دن اشتعال، طبیعت کے بے قابو پن، نگاہ کی عدم حفاظت اور وسوسوں کے طوفان سے بچ نہیں سکے گا، ذکر اس کے لئے ان ساری چیزوں سے بچاؤ کے سلسلہ میں حصار کا کردار ادا کرے گا۔

دوسری چیز جو طالب کے لئے ناگزیر ہے، وہ ایسے افراد کی صحبت سے بچاؤ کی ہے، جو تصوف واہل تصوف واہل اللہ سے عناد رکھتے ہیں، اس لئے کہ ایسے لوگوں کی صحبت، قلب میں غیر معمولی تاریکی پیدا کرنے کا موجب بنتی ہے، بلکہ وہ فرد کو اہل اللہ اور ان کی صحبت سے دور کرنے اور ان سے باغی بنانے تک پہنچا سکتی ہے، تیسری چیز جس کی ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ جس طرح فرد کو دن میں تین چار بار کھانا کھانے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، اس کے بغیر اس کی توانائی میں کمی آجاتی ہے، اسی طرح فرد کو دن میں مختلف اوقات میں ذکر کی ضرورت درپیش ہوتی ہے، ورنہ روح مضطرب ہوجاتی ہے۔ اس لئے ہر نماز کے وقت چار پانچ منٹ کا ذکر بھی ضرور کرنا چاہئے۔ اس سے اس کی دل کی تشفی کی صورت پیدا ہوتی جائے گی، ماحول کی ظلمات اور نفس کے خلاف مزاحمانہ قوت میں اضافہ ہوتا رہے گا۔

(۵۲) اس وقت مادہ پرستی کی ہمہ جہتی طوفانی لہروں کی وجہ سے ہر فرد سخت ذہنی دباؤ کا شکار ہے۔

بچوں کے بگڑ جانے کی پریشانی، بڑھتی ہوئی مہنگائی اور بچیوں کی شادی کے پیچیدہ مسائل کی وجہ سے ہونے والے تفکرات وغیرہ، لگ بھگ ہر فرد اس طرح کے بے شمار مسائل

کی وجہ سے مسائلستان بن گیا ہے۔

ان حالات میں افراد معاشرہ سے بھلائی کی سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ انہیں اللہ کی محبت اور ذکر وفکر کی راہ دکھائی جائے، اور اس کی دعوت دی جائے اس لئے کہ ان سارے مسائل کے پس پردہ اصل چیز جو کارفرما ہوتی ہے وہ احساس کی خرابی ہے۔ جب احساس خراب ہوجاتا ہے تو اس کے نتیجہ میں رویے اور کردار میں بگاڑ از خود پیدا ہوجاتا ہے۔ جب کہ احساس کی پاکیزگی سے فرد کی سوچ اور اس کے کردار میں پاکیزگی، رونق اور بہتری از خود پیدا ہوجاتی ہے۔ احساس کی یہ پاکیزگی اللہ کے ذکر اور اللہ سے والہانہ محبت کے نتیجہ میں ہی پیدا ہوتی ہے۔ دوسری صورت میں بظاہر چاہے سارے مسائل حل ہوتے ہوئے نظر آئیں، وافر مقدار میں دولت بھی حاصل ہوجائے، بہتر سے بہتر بنگلہ مل جائے، ان ساری سہولتوں کے باوجود ذہنی دباؤ سے بچاؤ کی صورت کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔

افراد معاشرہ کی بھلائی وبہتری کی واحد راہ اللہ کی محبت کے زیر اثر اسلامی شریعت پر عمل پیرا ہونا ہے اور ذکر کے نور سے بہرہ ور ہوکر اوصاف حمیدہ کا حامل ہونا ہے۔ اس بات کی حکمت وبصیرت سے دعوت دیتے رہنا لوگوں کے ساتھ ساری بھلائیوں سے زیادہ بھلائی کرنے کے مترادف ہے۔

(۵۳) اس نکتہ کا استحضار بھی ضروری ہے کہ اللہ کی محبت کی دنیا ایسی ہے، جہاں صبر واستقامت سے چلتے رہنا، ذکر وفکر اور عبادت کرتے رہنا ہے، حالات وکیفیات میں بہتری اور استقامت، مستقل مزاجی سے چلتے رہنے کے نتیجہ میں ہی آئے گی۔

طالب کے لئے بظاہر حالات کیسے ہی ناسازگار کیوں نہ ہوں، کیفیات میں کتنا ہی مدوجزر کیوں نہ ہو، اس کے لئے حوصلہ، ہمت اور صبر سے کام لئے بغیر چارہ کار نہیں، کسی بھی فن میں ماہرانہ صلاحیت کے لئے برسوں تک اس فن میں مستغرق ہونا پڑتا ہے، اس کے بعد کہیں جاکر اس فن کی گہرائیوں کا ادراک ہوتا ہے۔ راہ محبت تو ایسی راہ ہے، جس سے دنیا وآخرت کی ساری سعادتیں وابستہ ہیں۔ اس راہ کے تقاضے بھی یہی ہیں کہ طالب عرصہ

تک نفسی قوتوں سے معرکہ آرائی میں رہتا ہے۔ جب اللہ بندے کی ہمت وحوصلہ اور مستقل مزاجی کو دیکھتا ہے تو اسے نفس مطمئنہ کے مقام پر فائز فرماتا ہے۔

قرآن میں رسول اللہ ﷺ کو فرمایا جارہا ہے۔ **کذالک لنثبت**

(۵۴) انسانی فرد (جو مادہ کی پیداوار ہے) اس کی ساخت جن اجزاء سے ہوئی ہے، اس میں اپنی شخصیت سے پرستش کی حد تک محبت کا ہونا، مادی حسن پر فدا ہونا، دولت ودنیا پر ٹوٹ پڑنا، جذبہ شہرت وخودنمائی سے عبارت ہونا، دوسروں پر فوقیت حاصل کرنے کی چاہت اور اس کے لئے کاوشوں کا ہونا، جذبہ حسد کا ہونا، اس کی وجہ سے دوسروں کو گرانے کی کاوشوں کا ہونا، سیاسی، کاروباری، سماجی اور مذہبی دائرہ میں اپنی ذات کی بلندی وبرتری کی طاقتور خواہش کا ہونا، ضد وانانیت کے مظاہرہ کا ہونا، اپنے مفادات کی خاطر دوسروں کو پامال کرتے رہنے کی تمناؤں کا ہونا، مال کمانے کے لئے ہر طرح کے حربے استعمال کرنا، اس مقصد کے لئے مذہب کے مقدس نام تک کا استعمال کرتے رہنا، مختلف تعصّبات کا شکار ہونا، اپنے مخالفوں کی عزت وآبرو کو نقصان پہنچانے کی تمناؤں کا ہونا، معاصر شخصیتوں کو سماج میں آگے بڑھتے ہوئے دیکھکر جلن اور کڑھن محسوس کرنا، ذکر وفکر اور عبادت سے طبعی مناسبت کا نہ ہونا، ہر معاملہ کے منفی پہلوؤں کا غالب ہونا، شر، فساد اور بگاڑ کے خیالات وجذبات کا ابلتے رہنا، بات بات پر مشتعل ہونا، اپنی مصنوعی عزت ووقار کو بنیاد بنا کر افراد سے ٹکراؤ کا ہونا۔

غرض کہ روز مرہ زندگی میں نفس سے اس طرح کی بے شمار خرابیاں بلکہ خباثتیں صدور ہوتی رہتی ہے۔ اور یہ چیزیں نفس کی بنیادی ساخت میں شامل ہیں۔ اس لئے قرآن نے نفس کو الٰہ قرار دیا ہے اور نفس پرست افراد کو جانور بلکہ اس سے بدتر کہا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ نفس کی پرستش کرنے والے افراد کو علم کوئی فائدہ نہیں دیتا، اس لئے کہ ایسے لوگوں کے کانوں اور آنکھوں پر پردہ لگایا دیا ہے اور دل پر مہر لگا دی گئی ہے۔

نفس کی ان ہولناک قوتوں کی تہذیب کا کام ایسا ہے، جس سے فرد وافراد کی

انسانیت وابستہ ہے اور معاشرہ کا سارا خیر وفلاح وابستہ ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ فرد کی دائمی زندگی کی نجات وابستہ ہے۔ **فمن زحزح علی النار وادخل الجنة فقد فاز.** (جو جہنم کی آگ سے بچایا گیا اور جنت میں داخل ہوا، وہی کامیاب ہے)۔

فامامن طغیٰ وآثر الحیوٰة الدنیا فان الجحیم هی الماویٰ وامامن خاف مقام ربه ونهی النفس عن الهویٰ فان الجنة هی الماویٰ. (جس نے سرکشی اختیار کی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی، اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور جو شخص اللہ کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرتا رہا اور اور نفس کی خواہشات کو روکتا رہا (یعنی تہذیب نفس کے عمل میں مصروف رہا) اس کے رہنے کی جگہ جنت ہے۔

اللہ کی راہ محبت ایسی ہے، جو نفس کی ان طاقتور خواہشوں کے زور کو توڑنے اور فرد وافراد کو مہذب بنا کر آخرت کو مقصود بنانے کی راہ ہے۔ راہ محبت میں غیر معمولی مجاہدوں سے کام لینا ہوتا ہے۔ ذکر وفکر کے ان مجاہدوں کے ذریعہ جب نفسی قوتوں پر ضرب پڑتی ہے تو وہ مشتعل بھی ہوتی ہیں، اور نفس سے مقابلہ میں شدت بھی آجاتی ہے۔

اس طرح فرد وافراد کو روزمرہ زندگی میں نفس کی خوفناک قوتوں کا ذاتی طور پر مشاہدہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ اس مجاہدہ میں کبھی فرد تھک جاتا ہے اور اس کا حوصلہ جواب دینے لگتا ہے تو کبھی وہ خوشی خوشی اس راہ پر گامزن ہوتا رہتا ہے۔

اہل اللہ کی صحبت اور ان سے رابطہ کا عمل، فرد وافراد کو اس راہ میں نئے حوصلے اور ہمت کے ساتھ چلنے کی مہمیز کر دیتا ہے اور صحبت کے ہر عمل سے فرد، نفس کے خلاف معرکہ آرائی میں نئی طاقت محسوس کرتا ہے۔ جب تک طالب نفس مطمئنہ کے ابتدائی مقام تک نہیں پہنچتا، اس وقت تک نفس کے خلاف ذکر وفکر کے اس کے غیر معمولی مجاہدے جاری رہتے ہیں۔ نفس مطمئنہ کے مقام تک رسائی کے بعد طالب کے لئے آسانی ہی آسانی ہے اس کے بعد اس کے مجاہدوں کے عمل میں کمی آجاتی ہے، اس لئے کہ اب نفس کا بے لگام گھوڑا، مہذب گھوڑے کی صورت اختیار کر چکا ہے، جو کبھی کبھار لاتیں مارتا ہے اور معمولی کوشش

سے کنٹرول میں آجاتا ہے۔

(۵۵) اس راہ کو طے کرنے والا مربی، طالب کو جدوجہد کے ہر موڑ پر یقین دلاتا ہے کہ پریشان ہونے، گھبرانے اور حوصلہ ہارنے کی کوئی بات نہیں، جس محبوب نے راہ محبت کا راستہ عطا فرمایا ہے، وہی منزل مقصود تک پہنچا کر رہے گا، دروازہ کھٹکھٹانا طالب کا کام ہے۔ دروازہ کھول کر اندر داخل کرنا محبوب کا کام ہے، طالب کا کام مجاہدوں سے کام لیتے رہنا ہے، بتدریج ارتقائی حالات سے گذار کر مقام تک پہنچانا یہ محبوب حقیقی کا کام ہے۔

یہ سعادت عظمیٰ انہی طالبوں کو عطا ہوتی ہے، جو آخرت کے مقابلہ میں دنیا کو ترجیح دینے کے میلانات ورجحانات سے محفوظ ہوتے ہیں، جو اللہ کی محبت یعنی آتش عشق میں جلنے کے لئے تیار رہتے ہیں، ایسے طالبوں کو اس بات کا سو فیصد یقین رکھنا چاہئے کہ محبوب حقیقی ہر صورت میں ان کی قدر دانی کر کے انہیں اپنے قرب کی دولت عطا فرمائے گا۔

جو طالب اپنی مصروفیات کی وجہ سے ذکر وفکر کے مجاہدوں کے لئے زیادہ وقت دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ لیکن وہ متفکر ومضطرب رہتے ہیں۔ اور محبوب حقیقی کے جلالی صفات کے عکس کی حالت میں رہتے ہیں۔ اور روزانہ ایک سے ڈیڑھ گھنٹے تک ذکر وفکر کے لئے وقت نکالتے ہیں، مربی ایسے طالبوں کو بھی یقین دلاتے ہیں، کہ انشاء اللہ وہ بھی راہ محبت کی سعادتوں وبرکتوں سے بہرہ ور ہو کر رہیں گے۔ شرط یہ ہے کہ وہ صحبت ورابطے کے عمل کو کسی بھی موڑ پر منقطع نہ ہونے دیں۔ اس لئے کہ صحبت ورابطہ کے انقطاع کے بعد ذکر وفکر کے لئے ذوق وشوق کی فضا باقی نہیں رہتی۔

(۵۶) موجودہ دور میں نفس اور نفسی خواہشوں کو طاقتور بنانے اور مشتعل کرنے میں جدید میڈیا نے فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے، جس میں ٹی وی، انٹرنیٹ اور موبائل وغیرہ شامل ہیں، موجود دور کے سرمایہ دار کی ساری صنعتی پیداوار کا بنیادی ہدف ایک ہی ہے، وہ یہ ہے کہ افراد کی خواہشات نفس کو زیادہ سے زیادہ ابھارا جائے اور ان میں نت نئی اشیاء کی طلب

وامنگ پیدا کی جائے، سامان زینت وتعیش کی حرص کو طاقتور بنایا جائے۔ تاکہ اس کی صنعتوں کا پہیہ گھومتا رہے اور اس کی پیداوار کی زیادہ سے زیادہ کھپت کی صورت پیدا ہوتی رہے۔

ٹی وی، انٹرنیٹ اور موبائل وغیرہ خواہشات نفس کو ابھارنے، طاقتور بنانے اور اس کے دبے ہوئے جذبات حرص کو ابھارنے میں سرمایہ دار کے لئے سب سے طاقتور ہتھیار ہے، اس ہتھیار کو استعمال کر کے، وہ انسان سے اس کے انسانی جوہروں کو سلب اور فطرت کو مسخ کر کے، اسے ترقی یافتہ حیوان بنانے کی کوششوں میں مصروف ہے۔

ان حالات میں نفس کی تہذیب اور اس کی اصلاح کا کام پہلے کے مقابلہ میں بہت زیادہ دشوار ہو گیا ہے اور زیادہ مجاہدوں کا متقاضی بھی ہے، تاہم فساد زدہ حالات میں اللہ کی طرف سے اپنے کمزور بندوں کے لئے اپنے فضل کی خصوصی صورتوں کا پیدا ہونا بھی اس ذات رحیم وکریم کے شایان شان ہے، اگر فرد وافراد میں اصلاح کی طلب پیدا ہو جائے اور فرد صدق دل سے اس راہ پر گامزن ہو جائے تو اسے قدم قدم پر اللہ محبوب کی نصرت، حوصلہ افزائی اور فضل خاص کی صورتیں نظر آنے لگتی ہیں، بس اصل چیز طلب ہے۔ طلب کے بعد طالب کے ساتھ اللہ کا فضل شامل ہو ہی جاتا ہے۔

ویزید اللہ الذین اھتدو ھدی. (سورۃ مریم ۷۶) (جو ہدایت پر ہیں، اللہ ان کی ہدایت پر اضافہ پر اضافہ فرماتے رہتے ہیں)۔

والذین اھتدوا زادھم ھدی واتاھم تقوٰھم. جو ہدایت پر ہیں ان کی ہدایت میں اضافہ فرماتے ہیں اور تقویٰ میں بھی۔

(۵۷) موجودہ دور میں فرد وافراد کے ساتھ سب سے بڑا المیہ جو ہوا ہے جس سے سارے المیوں نے جنم لیا ہے وہ یہ ہے کہ دل جو انوارِ الٰہی کے اخذ کا مرکز ہے، جو محبوب حقیقی کے جذبات محبت سے سرشار ہے، ہمارے سارے ادارے دل کی ان صلاحیتوں کو معطل کرنے کی کاوشوں میں مصروف ہیں۔ گھر کے بنیادی اور ابتدائی ادارے سے لے کر

تعلیم وتربیت اور ریاست کے سارے ادارے اس بات کے لئے کوشاں ہیں کہ فرد کو یہ ادراک ہی نہ ہونے دیا جائے کہ اس کے اندر دل کی جوہری قوت بھی موجود ہے جو انسانی شخصیت کی صحتمند بنیادوں پر تعمیر میں فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ انسان کے اندر گوشت کا ایک ٹکرا ہے وہ اگر صحیح ہوجائے، تو ساری زندگی صحیح ہوجاتی ہے وہ اگر خراب ہوجائے تو فرد کی ساری زندگی فساد سے عبارت ہوجاتی ہے، فرمایا گوشت کا یہ ٹکرا دل ہے۔

حدیث قدسی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں کائنات کی کسی چیز میں نہیں سما سکتا، سوائے بندہ مؤمن کے دل میں۔

ہر انسان کا دل فطری طور پر محبوب حقیقی کے لئے مضطرب رہتا ہے، اس کے ساتھ والہانہ محبت کے ذریعہ اپنے سارے جذبات کی تسکین چاہتا ہے۔ **فطرت الله التی فطر الناس علیها** (یہ انسان کی وہ فطرت ہے، جس پر اللہ نے تمام انسانوں کو پیدا کیا ہے)۔

اللہ سے والہانہ محبت کے ذریعہ نفسی ومادی قوتوں کا مقابلہ کرنا، عقیدہ توحید کو شخصیت کے رگ وپے میں شامل کرنا، اسلام کو دستور حیات بنا کر، اسے اپنی زندگی میں نافذ کرنا، تخلقوا باخلاق اللہ (اللہ کے اخلاق اختیار کرنا) داخلی وخارجی باطل سے مقابلہ کے لئے مستعد ہونا، یہ سارے کام ہیں، جو اللہ کی محبت سے لبریز دل کے ذریعہ ہی سرانجام ہوتے ہیں۔ قرآن دل کی اس فیصلہ کن اہمیت اور اس کی ان صلاحیتوں سے بھرا ہوا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے موجودہ دور میں ہمارے سارے ادارے دل کی ان خفتہ صلاحیتوں کو برباد کررہے ہیں اور سرے سے اس کی ان صلاحیتوں سے انکار روش غالب ہے۔ تصوف واحسان کی راہ دراصل دل کی ان صلاحیتوں کی بیداری کی راہ ہے، اس کے ذریعہ فرد وافراد کی محبوب حقیقی کے لئے محبت کے بے پناہ جذبات کو بیدار کرکے اسے صحیح رخ دینے اور اس کے ارتقائی مراحل طے کرانے کی کوشش ہوتی ہے۔ جس سے فرد وافراد مادیت سے اوپر اٹھکر انسانی جوہروں سے بہرہ ور ہوتے ہیں اور اللہ کی مرضی اور اس کی شریعت کو اپنی

ذات پر اور افراد معاشرہ پر نافذ کرنے کے جذبات سے سرشار ہوتے ہیں۔

انسانی شخصیت کا یہ خاصہ ہے کہ جب محبوب حقیقی کے لئے دل کے اضطراب اور بے قراری کو صحیح راستہ نہیں ملتا یعنی اس کی صحیح تشفی کی راہ مسدود ہوجاتی ہے تو دل اپنی تشفی کے لئے غلط نصب العین سے محبت کی راہ پر گامزن ہونے لگتی ہے، جس کے وہ اثرات ظاہر ہوتے ہیں، جو اس وقت ہمارے معاشرے میں پوری طرح ظاہر ہو چکے ہیں کہ ہر ذہین وباصلاحیت فرد مادہ پرفریفتہ ہے اور اپنی ساری صلاحیتیں مادی مقاصد کے حصول میں صرف کررہا ہے۔ جس سے معاشرہ ہولناک فساد سے دوچار ہوگیا ہے، ان حالات میں ضرورت ہے کہ جدید طبقات کو انسانی شخصیت میں موجود دل کی اہمیت، اس کی اصل غذا اور اس کی بے پناہ خفتہ صلاحیتوں اور اس کی بیداری کی طرف دعوت دی جائے، اس میں دل کے بارے میں امریکہ میں ہونے والی جدید تحقیق بھی معاون ثابت ہوسکتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ انسانی دل اس قدر غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل ہے کہ اس میں انسانی عقل جیسی ہزاروں توانائیوں کی حامل عقلیں موجود ہیں۔

(۵۸) بدقسمتی سے ہماری قوم کے مزاج کی تشکیل میں جو چیزیں شامل ہوگئی ہیں، ان میں بدنظمی، بےصبری، قومیتی، گروہی ومسلکی تعصب، مفادات کی جنگ، اصولوں کی پامالی، رشوت، سفارش، جھوٹ، بدعہدی، سیاست کو دولت کمانے کا ذریعہ بنانے کی روش، اجتماعی بہتری کے کاموں سے بےحسی، دولت پر سانپ بننے کی روش، امیروں کو مزید امیر اور غریب کو غریب تر بنانے کی پالیسیاں، تعلیمی نظام کے ذریعہ مفاد پرست اور نفس پرست افراد کی فوج ظفر موج پیدا کرنے کی روش، دوسروں کے حقوق پامال کرنے بلکہ غصب کرنے کا مزاج، چھوٹی چھوٹی چیزوں پر ایک دوسرے سے تصادم، ضرورت کے وقت دوسروں کے کام نہ آنے کا مزاج، گروہوں اور قومیتوں کو ایک دوسرے سے متصادم کرنے کی کاروائیاں، دشمن سے پیسہ لے کر اس کے مقاصد کے لئے کام کرنے کی روش جیسی چیزیں شامل ہیں۔ کوئی بھی قوم اس طرح کے کردار کے ساتھ زیادہ دنوں تک زندہ

نہیں رہ سکتی۔ وہ طاقتور قوموں کا غلام بنے بغیر رہ سکے، ممکن نہیں۔ ہم اپنے اس کردار کی وجہ سے اسی فیصد سے زیادہ عملاً عالمی سرمایہ دار کے غلام بن چکے ہیں، ہمارا سارا ریاستی نظام انہی کی تیار کردہ پالیسیوں اور خطوط پر چل رہا ہے۔

ان حالات میں قومی مزاج کو تبدیل کرنے کے لئے معاشرہ میں بڑی مستعدی سے کام کرنے کی ضرورت ہے، افراد کو حکمت سے یہ نکتہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ تم جس مقصد کی خاطر یہ ساری غلط کاریاں کر رہے ہو، وہ مقصد سکون، خوشی اور لذت کا ہی حصول تو ہے۔ لیکن ان چیزوں سے تو سکون مزید برباد ہوتا ہے اور زندگی بے برکتی سے عبارت ہوجاتی ہے۔ اور ہر وقت ظلمات کی فضا غالب رہتی ہے، یہ غلط کاریاں تو ایسی ہیں جس سے اپنے لئے، اپنے قوم کے لئے اور اپنی نسلوں کے لئے آخرت کے جہنم سے پہلے اس دنیا میں جہنم خریدنے کے مترادف ہے۔ معاشرہ میں اس دعوتی کام کی سخت ضرورت ہے۔ معاشرہ کو بڑھتے ہوئے زوال اور تباہی سے بچانے کی واحد صورت یہی ہے۔

(۵۹) موجودہ دور میں افراد کی ذہنی اور نفسیاتی الجھنیں بہت زیادہ بڑھ گئی ہیں، اس لئے مسائل ومعاملات میں افراد سے الجھنے سے بچنا چاہئے، تندوتیز گفتگو کے جواب میں نرمی سے کام لینا چاہئے، اشتعال کے مقابلہ میں صرف نظری کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔ جن مسائل معاملات پر گفتگو سے فرد کی نفسیات میں موجود تلخیوں کے ابھر آنے اور ضد اور گرما گرمی پیدا ہونے کا خطرہ ہو، ان مسائل میں پڑنے سے ہر ممکن حد تک بچنا چاہئے۔ اپنے مزاج کی قربانی دے کر اور مالی نقصان برداشت کرتے ہوئے بھی افراد کو راحت پہنچانے کی کوشش کرنی چاہئے، افراد معاشرہ کی قابل رحم ذہنی حالت کی بنا پر طالب کے لئے یہ روش بہت ناگزیر ہے، اللہ کو بندہ کی یہ ادا بہت محبوب ہے، اس کی وجہ سے بندہ بہت سارے انعامات کا مستحق قرار پاتا ہے۔ ایک حدیث شریف ہے۔

اللہ تعالیٰ اس شخص کی عزت میں اضافہ کرتا ہے جو دوسروں سے عفوو درگزر سے کام لیتا ہے۔

دوسری حدیث میں فرمایا گیا جو شخص جھگڑا ترک کر دے ایسی حالت میں کہ وہ ناحق ہو، اس کے لئے جنت میں ایک کنارے پر گھر بنایا جائے گا، اور جو حق پر ہونے کے باوجود جھگڑا چھوڑ دے، اس کے لئے جنت کے درمیاں میں گھر بنایا جائے گا۔

(۶۰) صحبت اہل اللہ اور ذکر کی حیثیت ان طاقتور غذاؤں یا طاقتور دواؤں کی سی ہے، جو جسمانی طور پر کمزور افراد کو اٹھا کر کھڑا کر دینے کا ذریعہ بنتی ہیں، ان دونوں چیزوں سے محرومی کی وجہ سے وعظ ونصیحت کی باتیں مؤثر ثابت ہوسکیں اور عمل صالحہ کی قوت پیدا ہو سکے، مشکل تر ہے، بالخصوص باطنی بیماریوں سے بچاؤ اور اخلاق حسنہ اور للھیت پیدا ہو سکے، دشوار تر ہے، صحبت اور ذکر سے فرد کو روحانی طور پر ایسی توانائی ملتی رہتی ہے، جس سے اس میں اعمال صالحہ اور اخلاق حسنہ کی استعداد پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں فرد کو نفس سے معرکہ آرائی کی راہ پر گامزن کر کے، اللہ کی رضا کے مطابق زندگی گذارنے کے سلیقہ سے آشنا کر دیتی ہیں۔ اس کے بعد وعظ ونصیحت اور نیکی کی تلقین کی باتیں اور قرآن کی آیتیں فرد کے ایمان میں غیر معمولی اضافہ اور رقت وخشیت پیدا کرنے کا موجب بنتی ہیں۔

صحبت اور ذکر کی اس فیصلہ کن اہمیت کے پیش نظر ان دونوں چیزوں کا خصوصی اہتمام ضروری ہے، ذکر تو اس لئے کہ وہ ایک نور ہے جس سے دل روشن ہوتا ہے۔ صحبت اس لئے کہ ذکر کی استعداد اور اس کا ذوق وشوق اور باطنی بیماریوں کا ادراک اور ان سے بچاؤ کی فکرمندی، صحبت سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ یہی ہمارا تسلسل ہے اور یہی ہمارا تہذیبی ورثہ بھی ہے۔

تجربہ یہی بتاتا ہے کہ صحبت ورابطے میں کمی سے ذکر میں جمود پیدا ہونے لگتا ہے، ایمانی کیفیات وحلاوت میں کمی آنے لگتی ہے، اعمال میں سستی پیدا ہونے لگتی ہے۔

اس کے اسباب پر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ افراد کی زندگیوں میں فیصلہ کن تبدیلی برپا کرنے میں ہمیشہ صحبت ہی کا عمل دخل رہا ہے۔ شیطانی کردار کے حامل افراد کی صحبت سے اور ان کے دلوں سے منفی اثرات یا منفی شعائیں نکل کر فرد وافراد کے دلوں کو تاریک سے

تاریک بنانے کا موجب ثابت ہوتی ہیں۔ پھر صحبت کی یہی منفی شعائیں انہیں اعمال بد کی راہ پر گامزن کردیتی ہیں۔ اسی طرح صالح افراد کی صحبت سے ان کے دلوں سے ایمان ویقین اور ذکر کی شعائیں نکل کر دلوں کو منور کرنے لگتی ہیں اس طرح فرد وافراد کے لئے نیکی پر چلنا اور ذکر وفکر کرتے رہنا اور عبادت وعبدیت کی راہ پر گامزن ہونا آسان ہونے لگتا ہے۔

اس لئے قرآن میں اللہ تعالیٰ نے **اھدنا الصراط المستقیم** کے بعد صراط القرآن والحدیث فرمانے کے بجائے **صراط الذین انعمت علیھم** یعنی انعام یافتہ لوگوں کی راہ پر چلنے کی دعا سکھائی ہے۔

(۶۱) قرآن، اللہ کی ایسی کتاب ہے جو دلوں کو لرزا دینے والی اور نفسی قوتوں کو پامال کرنے والی کتاب ہے۔ افراد کے باطن میں تہلکہ مچادینے والی کتاب ہے، ایسی کتاب جو اگر پہاڑوں پر نازل ہوتی تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہوجاتے، اس طرح، انقلاب برپا کرنے والی کتاب سے ہم فیض حاصل کرکے پاکیزہ معاشرہ کی تشکیل میں آخر ناکام کیوں ہیں؟

ہمارے اندر وہ استعداد کیسے پیدا ہوسکتی ہے، جس سے ہم قرآن جیسی مقدس وبابرکت کتاب سے بہرہ ور اور فیضیاب ہوسکیں۔

جب افراد معاشرہ پر نفسی قوت غالب آتی ہے اور خواہشات کا گھیراؤ ہوجاتا ہے اور ساری شخصیت مادیت کی بنیاد پر تعمیر ہوتی ہے تو قساوت قلبی اور سنگ دلی پیدا ہوجاتی ہے۔ جو اپنے ساتھ بے شمار حجابات لاتی ہے، یہ حجابات ایسے سنگیں ہوتے ہیں کہ اول تو قرآن پڑھنے اور سننے کی توفیق نصیب نہیں ہوگی، اگر ہوتی بھی ہے تو قرآن کا نور نفسی قوتوں کے پیدا کردہ حجابات سے ٹکرا کر غیر مؤثر ہوجاتا ہے۔ اور یہ منظر نظر آتا ہے کہ قرآن بھی پڑھا جارہا ہے اور نفسی قوتوں کی پرستش بھی ہورہی ہے۔ قرآن کے نام پر امت میں تفریق کا کردار بھی ادا کیا جارہا ہے۔ قرآن کو اپنے ذاتی وجماعتی مفادات کے لئے استعمال کیا جارہا ہے۔ **یضل به کثیرا ویھدی به کثیرا.** کی صورت پیدا ہوجاتی ہے۔

اس طرح کے حالات میں قرآن سے فیض حاصل کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ جو

افراد مجاہدوں کے ذریعہ نفسی حجابات سے اوپر اٹھکر تزکیہ کی سعادت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اور نفس مطمئنہ، شرح صدر اور قلب سلیم کے اجزاء سے بہرہ ور ہوئے ہیں۔ ایسے افراد کے سامنے خود سپردگی اختیار کرکے نفسی حجابات سے دوری اور باطنی بیماریوں سے ازالہ کی راہ اختیار کی جائے۔ جب ایک حد تک نفسی حجابات دور ہوں گے اور تزکیہ ہوگا تو قرآن سے اخذ فیض کی راہ میں حائل رکاوٹیں ازخود دور ہوتی جائیں گی، اس طرح قرآن سے زندگی کا ہر پہلو بدل کر خدا پرستی کی بنیاد پر افراد معاشرہ کی تعمیر کی صورت پیدا ہوتی جائے گی۔

قرآن سے حقیقی استفادہ کے لئے اللہ نے جو شرط عائد کی ہے، وہ تقویٰ کی شرط ہے۔ ھدی للمتقین، چونکہ نفسی حجابات، حب جاہ وحب مال، حرص وہوس جیسی باطنی بُرائیاں، تقویٰ کے منافی ہیں۔ اس لئے ان بُرائیوں کی شدت کی صورت میں قرآن ہدایت نہیں دے سکتا۔

دوسری جگہ فرمایا گیا **ان فی ذالک لذکریٰ لمن کان له قلب.** اس قرآن میں نصیحت ہے اس شخص کے لئے جس کا قلب (زندہ) ہے۔

(۶۲) مسلمان کی حیثیت سے ہمارے لئے اصل اہمیت بلکہ فیصلہ کن اہمیت اور ہدایت کے اصل سرچشمے کی حیثیت قرآن وحدیث اور سیرت پاک کو حاصل ہے۔ قرآن وحدیث اور سیرت پاک کی منافی ساری چیزیں ناقابل قبول ہیں۔ صالحین اور اہل اللہ کی اہمیت یہ ہے کہ چونکہ ان پر صبغۃ اللہ (اللہ کا رنگ) غالب ہوتا ہے، وہ غیر معمولی مجاہدوں کے ذریعہ نفسی قوتوں کو اللہ ورسول کے تابع کرچکے ہوتے ہیں۔ ان کی دینی وایمانی حس غیر معمولی طور پر طاقتور ہوتی ہے، وہ حمیت دین سے سرشار ہوتے ہیں، وہ تزکیہ کی سعادت سے بہرہ ور ہوتے ہیں اور دوسروں کے تزکیے کی استعداد رکھتے ہیں۔ اس لئے وہ قرآن وحدیث اور سیرت پاک کے نقوش کو مستحکم کرنے اور ثبت کرنے کا مؤثر ذریعہ ہوتے ہیں۔ اہل اللہ کی کل حیثیت یہی ہے اس سے زیادہ نہیں۔ اگر ان کا کوئی عمل یا قول قرآن وحدیث کے منافی ہے تو وہ مسترد ہوگا۔ ان کی اہمیت تو صرف اور صرف اس لئے ہے کہ ان کی زندگیاں قرآن وحدیث اور سیرت پاک سے ہمہ آہنگ ہوتی ہیں۔

(۶۳) فرد جب کچھ بُری عادتوں کا اسیر ہوجاتا ہے تو یہ عادتیں مزاج کا حصہ بن جاتی ہیں، اب ان بُری عادتوں سے نجات حاصل کرکے نیک کاموں کی عادت ڈالنا غیر معمولی طور پر دشوار ہوتا ہے۔ مثلاً ایک فرد کثرت گوئی کا مریض ہے، دوسروں کی تحقیر کا عادی ہے، ہر نیک عمل میں ہمت وحوصلہ کے فقدان اور سستی کا عادی ہے تو ان عادتوں سے جان خلاصی حاصل کرنا انتہائی دشوار بلکہ حد سے زیادہ دشوار کام ہے۔ اس کی صورت ایک ہی ہے کہ فرد وافراد میں ان سے جان خلاصی کی حقیقی طلب پیدا ہوجائے اور یہ طلب اضطراب کی حد تک پیدا ہوجائے پھر یہ اضطراب اسے صالحین کی صحبت میں لے جائے، ان کی صحبت اور ذکر کے نورانی ماحول کے زیر اثر ان کی ساری عادتیں آہستہ آہستہ چھوٹتی چلی جائیں۔

(۶۴) اللہ کی محبت کی زندگی مسرتوں، حلاوتوں اور طمانیت سے سرشار زندگی ہے۔ ایسی مسرتیں جن پر مادی دنیا کی سو زندگیاں بھی نچھاور کی جائیں تو سستا سودا ہے، لیکن انسانیت کا کتنا بڑا المیہ ہے کہ وہ محبوب حقیقی کی محبت کی دنیا میں آنے کے لئے تیار نہیں۔ ایک اہل اللہ نے کتنی عمدہ نشاندہی کی ہے، کہتے ہیں، ہمیں عبادت وذکر وفکر کے ذریعہ جو حلاوتیں اور مسرتیں حاصل ہیں، اگر بادشاہان وقت کو ان کا ادراک حاصل ہوجائے تو وہ ہم سے یہ حلاوتیں چھیننے کی جنگ کریں۔

گفتگو چاہئے کتنی ہی عمدہ کیوں نہ ہو، اس سے مبتدی ومتوسط طالب کو اذیت ہوتی ہے۔

مبتدی ومتوسط طالب کی گفتگو میں نفس کی آمیزش شامل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس لئے مربی کی طرف سے انہیں کم سے کم بولنے کی تاکید ہوتی ہے، ویسے بھی راہ سلوک کے یہ دو بنیادی اصول ہیں، جو کسی صورت میں معاف نہیں ہوسکتے، ایک کم بولنا، دوسرا کم ملنا۔

مبتدی ومتوسط طالبوں کی ذکر وصحبت کے بعد بیشتر ترقی ان اصولوں کی پابندی سے وابستہ ہوتی ہے۔ مبتدی ومتوسط طالب کو زندگی کے ہر موڑ پر اس کا تجربہ ہوتا ہے کہ اس نے جب بھی مذکورہ دونوں اصولوں کی خلاف ورزی کی، اسے اس کی نقد سزا ملی، وہ سزا دل پر

حجابات پیدا کرنے اور کیفیات کی سلبی کی صورت میں لاگو ہوتی ہے۔

منتہی طالب بھی اکثر یہ محسوس کرتا ہے کہ اس نے ضرورت سے زیادہ گفتگو کی تو اس سے لغزشیں صادر ہونا شروع ہوجاتی ہیں۔ اس لئے حدیث شریف میں فرمایا گیا۔

جو چپ رہا، اس نے نجات پائی، ایک دوسری حدیث میں ہے کہ اسلام کا حسن یہ ہے کہ فرد لایعنی باتوں سے بچا رہے۔ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ جو شخص مجھے دو باتوں کی ضمانت دے، میں اسے جنت کی ضمانت دیتا ہوں، ایک شرمگاہ کی حفاظت کی ضمانت دوسرے زبان کی حفاظت کی ضمانت۔

دراصل گفتگو سے ایمانی اور روحانی قوت خرچ ہوتی ہے۔ یہ قوت ذکر وفکر وعبادت کے مجاہدوں سے پیدا ہوتی ہے۔ فرد جب گفتگو میں ضرورت سے تجاوز شروع کردیتا ہے تو طالب محسوس کرتا ہے کہ مجاہدوں کے نتیجہ میں حاصل شدہ توانائی کا ذخیرہ ختم ہورہا ہے اور اس کی گفتگو میں تاریکی کی آمیزش شامل ہونا شروع ہوگئی ہے۔

البتہ طالبوں کے اشکالات کے حل، ان کی علمی، ذہنی وروحانی تربیت کے حوالے سے ہونے والی گفتگو اس سے مستثنیٰ ہے، اس طرح کی گفتگو سے روحانی استاد اور طالبوں دونوں کو فائدہ ہوتا ہے۔

(۶۵) طالب کو یہ نکتہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ جب تک کثرت ذکر کے ذریعہ اللہ سے محبت اپنے کمال کو نہیں پہنچتی، اس وقت تک اس کے جذبۂ محبت کا ایک حصہ غیر مطمئن رہے گا اور عقل کو شکوک وشبہات پیدا کرنے کا موقعہ ملتا رہے گا۔ طالب کا یہ سفر اس وقت تک وقت پوری مستعدی کے ساتھ جاری رہے گا، جب تک جذبۂ محبت کے سارے حصے اللہ کی محبت کے لئے مخصوص نہیں ہوجاتے، اس مقام تک پہنچے بغیر طالب ان پاکیزہ اوصاف سے پوری طرح بہرہ ور ہوسکے، جو سلوک کا حاصل ہیں، ممکن نہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ عقل اور نفس کی طرف سے پیدا کردہ وسوسوں، شریعت پر عمل پیرا ہونے میں آسانی، سیرت وکردار میں پاکیزگی، پوری طرح سکون قلب کی نعمت کا حصول،

للھیت میں نفس کی آمیزشوں سے حفاظت، نفس پرستی کی طوفانی لہروں سے بچاؤ، تہذیب نفس کی کاوشوں میں کامیابی۔ یہ ساری سعادتیں جذبہ محبت کو کمال درجہ تک پہنچانے سے ہی وابستہ ہے۔ اس مقام پر رسائی تک طالب کو حوصلہ وہمت کے ساتھ چلنا پڑتا ہے۔ چلے بغیر چارہ کار نہیں۔ بلکہ محبت خود حقیقی طالب کو کشش کے ذریعہ اس راہ پر مسلسل چلاتی رہے گی۔

محبوب کی راہ جہاں مشقتوں اور مصائب سے بھری ہوئی ہے، وہاں یہ راہ بے پناہ لذتوں وحلاوتوں سے بھی سرشار بھی ہے، اس لئے حقیقی طالب، راہ محبت میں پیش آنے والی ساری مشکلات کو محبوب کی عطا سمجھکر برداشت کرنے کے لئے تیار رہتا ہے، طالب کی یہی وہ ادا ہے، جس کی وجہ سے اسے محبوب کی طرف سے بالآخر یہ دولت مل کر رہتی ہے۔

(۶۶) مبتدی طالب کی تمنا ہوتی ہے کہ اسے معلوم ہو کہ راہ سلوک وراہ محبت کی علامتیں کیا ہیں تاکہ ہم ان علامتوں کی روشنی میں اپنے حالات کا جائزہ لے سکیں۔

راہ سلوک کی علامتوں میں درج ذیل چیزیں شامل ہیں۔ سکون وسکینت کا پیدا ہونا اور رفتہ رفتہ اس میں اضافہ ہوتے رہنا، بُرائی سے بچنے کی استعداد کا پیدا ہونا اور نیکی کے لئے دل کی چاہت کا ہونا، اور عملاً نیکی کی طرف بڑھتے رہنا، دنیا سے رغبت میں کمی کا واقع ہونا، ذکر کے دورانیہ میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتے رہنا، لوگوں سے سچی ہمدردی، خیر خواہی اور رواداری کا پیدا ہونا، دل کا نرم ہونا، لوگوں کے قصور معاف کرنے کے مزاج کا پیدا ہوتے چلے جانا، خوشی وغم کے ادلتے بدلتے ہوئے حالات کا پیدا ہونا، حالت اشتعال میں کمی کا آجانا، نفسی قوتوں سے معرکہ آرائی کی وجہ سے وسوسوں، خیالات اور تحت الشعور میں موجود ماضی کے واقعات کی یادوں کی وجہ سے تشویش کا پیدا ہونا، نفس کی حیرت انگیز قوتوں کا مشاہدہ ہوتے رہنا، روحانی استاد سے صحبت ورابطہ میں اضافہ ہوتے رہنا، متوجہ الی اللہ ہونے کی نفسیاتی فضا کا پیدا ہونا، ایک نئی معنوی اور حقیقی زندگی کی یافت کے احساس کا غالب آنا، لوگوں کی خوشی وناخوشی سے بے نیاز ہونا، نظروں کی حفاظت کا ہونا، مالداروں سے متاثر نہ ہونے کی صلاحیت کا ابھرنا وغیرہ، لیکن یہ علامتیں انہی طالبوں میں زیادہ بہتر طور پر پیدا ہوں گی، جن کا ذکر وفکر

ومراقبہ کا دورانیہ ایک سے ڈیڑھ گھنٹہ تک معمول ہوجائے، تاہم اس سے کم ذکر ومراقبہ سے بھی یہ کیفیات زیادہ بہتر طور پر نہ سہی، کسی نہ کسی حد تک مبتدی طالب کو نصیب ہوں گی۔

مبتدی طالب کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دوران مراقبہ وسوسوں اور خیالات کے ہجوم میں گھرا رہتا ہے۔ اور اس کا مراقبہ ان وسوسوں کی نذر ہوجاتا ہے، وہ دس پندرہ منٹ کے مراقبہ سے آگے نہیں بڑھتا، یہ وسوسے دراصل لاشعور میں موجود زندگی بھر کے واقعات اور اعمال کے اثرات کا حصہ ہوتے ہیں۔ ان وسوسوں کے طوفان سے گھبرانے کی بالکل ضرورت نہیں۔ مستقل مزاجی سے مراقبہ کرتے رہنے اور آہستہ آہستہ مراقبہ کے دورانیہ کو بڑھاتے رہنے سے یہ وسوسے ازخود چھٹتے اور کم ہوتے چلے جائیں گے۔ مبتدی طالب کو غیر معمولی ہمت وحوصلہ سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ ہمت وحوصلہ سے راستے کھلتے چلے جاتے ہیں۔

(۶۷) متوسط طالب کی ایک بڑی علامت یہ ہوتی ہے کہ غیر ضروری باتوں اور غیر ضروری تعلقات سے اسے ازحد بیزاری بلکہ وحشت ہوتی ہے، چونکہ وہ نفس پرستی کی قوتوں سے معرکہ آرائی کی عروج کی حالت میں ہوتا ہے، اس لئے اس حالت کے تسلسل میں رکاوٹ پیدا کرنے والی چیزوں سے وہ حالت اشتعال میں آجاتا ہے، اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ اس کا دل ہمہ وقت محبوب حقیقی کے انوار سے فیضیاب ومتمتع ہوتا رہے۔ ذکر اس کی غذا بن جاتی ہے۔ جس طرح مچھلی پانی سے باہر تڑپ کر رہ جاتی ہے، یہی حالت متوسط طالب کی ہوتی ہے۔

متوسط طالب پر فنائیت کا غیر معمولی غلبہ ہوتا ہے، وہ اپنے آپ کو ہیچ در ہیچ سمجھتا ہے، اس لئے کہ اسے روزانہ اس بات کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ اس کے جو بھی لمحات ذکر وفکر کے بغیر گذرتے ہیں، ان لمحات میں باطن سے ابھرنے والے جذبات ووسوسے اسے حب جاہ وحب مال اور حرص وہوس وحسد جیسے میلانات کی طرف لے جانے کا ذریعہ بنتے ہیں، اس لئے متوسط طالب انتہائی ضروری کاموں کے علاوہ دوسری معاملات کی طرف توجہ نہ دینے پر مجبور ومعذور ہوتا ہے۔ البتہ متوسط طالب کے ساتھ اللہ کا یہ فضل خاص ہوتا ہے کہ اس کے کاموں

میں آسانی پیدا کردی جاتی ہے، بلکہ اس کے کاموں کی سرانجامی کی صورت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔

مشکلات کے ہر موڑ پر وہ محسوس کرتا ہے کہ غیب سے اس کی مدد کی صورت پیدا ہوتی جارہی ہے۔ البتہ بعض اوقات اس کے صبر کی آزمائش اور اس کی استقامت کے لئے اسے مصائب میں مبتلا کردیا ہے۔

ان مصائب پر صبر کے نتیجہ میں اس کے لئے انعامات کی راہیں کھول دی جاتی ہے اور اسے استقامت کی نعمت عظمیٰ عطا کردی جاتی ہے۔

متوسط طالب جب صبر آزما جدوجہد اور تھکا دینے والے سفر کے بعد حالت فنا سے حالت بقا میں آتا ہے، اور وہ اس سفر کے دوران پیش آنے والے حالات اور مدوجزر اور درپیش طوفانوں کی طرف مڑ کر دیکھتا ہے تو اسے یہ صبر آزما جدوجہد بہت یاد آتی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ کاش ایسا ہو کہ محبوب حقیقی اسے دوبارہ توانائیوں سے سرشار زندگی عطا فرما دے، تاکہ میں اس کے لئے دوبارہ آتش عشق میں جلتا رہوں اور اس کے لئے کڑھتا رہوں، اور اس کے لئے فنا ہوتا رہوں، اس لئے کہ یہ جدوجہد بہت زیادہ دشوار ہونے کے ساتھ ساتھ لذت وحلاوت سے بھی سرشار ہے اور زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔

(۶۸) منتہی صوفی جن حالات میں رہتا ہے، وہ صبر وشکر کے حالات ہیں، وہ اپنے رب کے ان انعامات کی شکر گذاری ادا کرنے سے قاصر ہوتا ہے، جو اس نے اسے نفس پرستی کی بے پناہ قوتوں سے بڑی حد تک بچا کر، اس کے لئے اپنی اطاعت کو آسان کرنے کی صورت میں فرمائے ہیں۔

منتہی صوفی کی سب سے بڑی آرزو یہ ہوتی ہے کہ اسے معنوی اولاد حاصل ہو، تاکہ محبوب حقیقی کے لئے صبر آزما جدوجہد اور نفس کے خلاف معرکہ آرائی کرنے والوں کا یہ قافلہ آخر وقت تک جاری وساری رہ سکے۔ اس طرح انسانیت، انسانی جوہروں سے بہرہ ور ہوتی رہے۔ اس آرزو کی وجہ سے منتہی صوفی، معاشرہ میں ایسے صاحب استعداد افراد کی تلاش میں

رہتا ہے، جو راہ محبت میں چلنے کا ذوق رکھتے ہوں، اور جن کی فطرت سلیمہ کے کچھ نہ کچھ اجزاء محفوظ ہوں۔

جب منتہی صوفی کو مادہ پرست معاشرہ سے اس طرح کے افراد ملتے ہیں تو وہ بے پایاں مسرت سے سرشار ہونے لگتا ہے اور پوری توجہ سے ایسا طلبہ کو محبوب کی راہ پر چلانے کے لئے کوشاں ہوتا ہے۔ یہ کہنا بجا ہے کہ وہ اپنی زندگی کا کل سرمایہ ایسے طلبہ ہی کو شمار کرتا ہے۔

(۶۹) راہ محبت کی جدوجہد اس اعتبار سے بھی قیمتی اور عظیم جدوجہد ہے کہ طالب کو اپنا سارا متاع حیات اس میں صرف کرنا پڑتا ہے، ذہن، دل اور اعصاب کی ساری صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے محبوب کی راہ پر چلنا پڑتا ہے۔ جب وہ تھک ہار کر چور ہوجاتا ہے، تھوڑا سا آرام کرکے پھر از سرنو وہ محبوب کی راہ، اس کی عبادت وذکر وفکر کی راہ پر چلنے لگتا ہے۔ اس جدوجہد میں خون جگر صرف کرنا ہوتا ہے، توانائیوں کا آخری حد تک استعمال کرنا پڑتا ہے۔ طالب روزانہ مرتا ہے اور روزانہ زندہ ہوتا ہے۔

محبوب کے جلالی صفات کے عکس اس کے لئے قیامت خیز ہوتے ہیں۔ وہ برسوں تک ان حالات سے گذر کر کندن ہوجاتا ہے۔

محبوب حقیقی کے لئے نفس سے معرکہ آرائی کی یہ جدوجہد دنیا میں دوسرے مقاصد کے لئے ہونے والی جدوجہد سے ہر اعتبار سے مختلف اور عہد ساز جدوجہد ہوتی ہے۔ یہ جدوجہد انسانیت کا سلیقہ سیکھنے کی جدوجہد ہوتی ہے۔ اللہ کے وفادار بندہ کی حیثیت سے زندگی گذارنے کی استعداد کی جدوجہد ہوتی ہے۔ محبوب کے انوار حسن سے متمتع ہونے کی جدوجہد ہوتی ہے۔ محبوب کے یہی انوار حسن ہیں، جو جنت میں اپنی اصل صورت میں ظہور پذیر ہوں گے۔ جس جدوجہد کے یہ ثمرات ہوں کہ محبوب کا مشاہدہ حاصل ہو (دنیا میں نہ سہی، آخرت میں۔ دنیا میں دل پر اس کے مشاہدہ کے عکس کی حالت نمودار ہو) اس جدوجہد کی اس سے بڑھکر عظمت اور کیا ہوسکتی ہے۔ خوش نصیب ہیں، وہ افراد جو خوشی خوشی راہ محبت کے لئے اپنے آپ کو وقف کرتے ہیں اور اس راہ میں اپنی توانائیوں کا آخری حد تک استعمال کرتے ہیں۔

(۷۰) منتہی صوفی کو ایک نیا علم بھی عطا ہوتا ہے، یہ وہی علم ہوتا ہے جو فطرت کی گہرائیوں اور قرآن کی روح میں موجود ہوتا ہے، نفس پرستی کی قوتیں اور اس کے پیدا کردہ حجابات اس علم کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔

مجاہدہ سے جب نفس کا بڑی حد تک تزکیہ ہوجاتا ہے تو یہ علم، باطن کی گہرائیوں سے پھوٹ کر نکلتا ہے۔ اس وقت طالب یہ دیکھکر حیرت زدہ ہوجاتا ہے کہ اس کے باطن کی گہرائیوں سے ظاہر ہونے والا سارا علم، قرآن سے سو فیصد مطابقت رکھتا ہے، اس وقت طالب کو قرآن کی تلاوت سے جو عبرت وموعظت حاصل ہوتی ہے اور قرآن اس کے جذبات عبدیت میں جس طرح اضافہ کرتا ہے، وہ ایسے جذبات ہیں جو ناقابل بیان ہیں۔ جو قیل سے نہیں، حال سے تعلق رکھتے ہیں۔

(۷۱) منتہی صوفی کی زندگی، رسول اللہ ﷺ کے نقوش زندگی سے قریب سے قریب تر ہوتی ہے۔

وہ حمیت دین سے سرشار ہوتا ہے، ہر سنت پر عمل پیرا ہونے کا حریص ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کے لئے شفیق ہوتا ہے۔ زہد اور دنیا واہل دنیا سے بے نیازی اس کا ورثہ ہوتی ہے۔ وہ توکل وسادگی اور محبت کا نمونہ ہوتا ہے۔

منتہی صوفی کی زندگی دیکھکر ہم جیسے مبتدی طالب حسرت ہی کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس زندگی کے کچھ اجزاء ہی عطا فرمائے۔ منتہی صوفی کو دیکھکر جب ہم اپنے حالات پر نظر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہماری حالت اس کچی اینٹ کی طرح ہے جو ایک ہی ضرب سے ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے۔ کہاں منتہی صوفی اور کہاں ہم جیسے مبتدی طالب۔

اللہ کی ذات سے امیدیں ہیں کہ وہ اہل اللہ کی صحبت کی برکت سے ہمیں نفس کی کدورتوں سے نجات دلا کر، نفس مطمئنہ کے کچھ اجزاء سے بہرہ ور فرمائے گا۔

(۷۲) راہ سلوک میں سالکوں کو جو کچھ بھی عطا ہوتا ہے، وہ طلب کی بنا پر ہی عطا ہوتا ہے، طلب جتنی زیادہ ہوگی، عطا میں اتنی زیادہ زیادتی وفیاضی ہوگی۔ **ویھدی الیہ من اناب.** (جو

رجوع ہوتا ہے (اللہ) اسے ہی راستہ دکھاتا ہے)۔

طلب کی علامتوں میں سے کچھ علامتیں یہ ہیں۔ ہر قسم کے حالات میں ذکر وفکر کے لئے وقت نکالتے رہنا، دوست واحباب، عزیز واقارب اور شادی وغمی میں شرکت کے مسائل کو ذکر وفکر کی راہ میں حائل نہ ہونے دینا، ذکر وفکر کے حلقوں میں وقت پر شرکت کرنا اور اس کے لئے بے قراری وانتظار کا ہونا، دوست واحباب اور اہل خانہ پر اپنے رویے سے یہ بات واضح کرنا کہ اس کا وقت سب سے قیمتی ہے، وہ ایک لمحہ کے ضیاع کا بھی متحمل نہیں، جب طالب کی طلب اس سطح اور نوعیت کی ہوگی تو وہ نوازا جائے گا اور اسے جلد ہی کشش کے ذریعہ حالت توسط میں لایا جائے گا۔ جہاں اس کے ذکر کا وقفہ آسانی سے دو تین گھنٹوں تک پہنچ جائے گا۔

طلب کی یہ سعادت فطرت سلیمہ کے اجزاء کی حفاظت کرنے، طبعی شرافت، لوگوں کو اذیت نہ پہنچانے کی ادا، ذوق وشوق سے خدمت دین کا کام کرنے، خدمت خلق کے کاموں کو اہمیت دینے اور قرآن سے اصلاح نفس کی خاطر تعلق جوڑنے جیسی چیزوں سے بھی حاصل ہوتی ہے۔

جب سالک کا ذکر ومراقبہ دو تین گھنٹوں تک پہنچ جاتا ہے تو وہ حالت سکر میں آجاتا ہے۔ جہاں ذکر کی نفسیاتی ووجدانی فضا اس پر غالب ہونے لگتی ہے اور وہ سوتے، لیٹتے، جاگتے، ہر وقت متوجہ الی اللہ ہونے لگتا ہے، وہ دنیا واہل دنیا کے چکروں سے آزاد ہوجاتا ہے، البتہ خیال کی مکمل یکسانیت پیدا ہونے اور انتشار فکری اور وسوسوں سے پوری طرح بچنے کی سعادت کے حاصل ہونے میں بہت وقت لگتا ہے۔ اگر دوران ذکر ومراقبہ خیالات کا ہجوم ہونے لگتا ہے اور لاشعور سے ماضی کے واقعات اور یادیں آنے لگتی ہیں یا اہل وعیال اور مستقبل کے حوالے سے فکرمندی کے وسوسے لاحق ہونے لگتے ہیں، تو اس پر تشویش کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وسوسوں کا یہ عمل برسوں تک جاری رہے گا۔

مسلسل ذکر وفکر کرتے رہنے اور اندر میں غوطہ زن ہوتے رہنے کے نتیجہ میں ایک وقت

آئے گا کہ وسوسوں اور تفکرات کے یہ طوفان تھم جائیں گے اور ذکر ومراقبہ میں یکسوئی کی فضا پیدا ہوجائے گی۔ اگر نفس امارہ کو شکست دے کر اللہ محبوب تک پہنچنا، اور اس کا قرب ووصال حاصل کرنا اتنا آسان ہوتا تو یہ نعمت ہر ایک کو نصیب ہوجاتی، لیکن یہ اللہ کی سنت ہے کہ نفس مطمئنہ تک پہنچنے کے لئے غیر معمولی مجاہدوں سے کام لینا ہوتا ہے۔ بعض اوقات زندگی کا بڑا حصہ اس جدوجہد میں صرف ہوجاتا ہے۔

خوش نصیب ہیں وہ افراد جنہیں سال دو کے اندر حالت توسط میں لایا جاتا ہے اور ان کا مراقبہ دو تین گھنٹہ تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ نعمت برسوں کی طلب اور جستجو کے نتیجہ میں ہی عطا ہوتی ہے۔

(۷۳) اللہ تعالیٰ ہر فرد کو قیمتی زندگی عطا فرماتا ہے، یہ زندگی اس لئے ہے تاکہ یہ دیکھا جائے کہ کون ہے جو اس زندگی کا صحیح استعمال کرتا ہے اور اچھے اعمال کرتا ہے **(الذی خلق الموت والحیوٰۃ لیبلوکم ایکم احسن عملا)** لیکن ہم میں سے کتنے افراد ہیں جو اس قیمتی زندگی کو بامقصد صرف کرتے ہوں، اور اسے اللہ کی عبادت وعبدیت کے مقصد میں صرف کرتے ہوں، اللہ کے بندوں سے بھلائی کرتے ہوں، آخرت کا کھٹکہ رکھتے ہوں، بہت کم افراد ہیں جو ایسا کرتے ہوں۔

ہم میں سے تقریباً ہر فرد کی حالت یہ ہے کہ دنیا کا جو سامان، عمارتیں، گاڑیاں اور پونجی جو اسی دنیا میں رہ جانے والی ہے، ہماری ساری فکر اور ساری جدوجہد کا ہدف یہی چیزیں ہوتی ہیں۔ ہم دنیا میں مٹی جمع کرنے اور مٹی کی تعمیرات کی فکر میں ساری زندگی صرف کردیتے ہیں۔

یہ انسان کا ایسا المیہ ہے، جو اسے اسفل السافلین یعنی حالت تک پہنچا دیتا ہے۔

دنیا کی ساری زندگی اللہ کی نظر میں آنکھ جھپکنے سے زیادہ نہیں ہے۔ **وما امر الساعۃ الا کلمح البصر او ھو اقرب** (وہ گھڑی واقع ہونے والی ہے آنکھ جھپکنے میں بلکہ اس سے بھی زیادہ قریب) دوسری جگہ ہے **ویوم تقوم الساعۃ یقسم المجرمون ما لبثو غیر ساعہ** (اس دن مجرم قسم

کھا کر کہے گا کہ میں دنیا میں نہ رہا تھا مگر ایک لمحہ)۔

آنکھ جھپکنے یا ایک لمحہ کی زندگی کیا ہوسکتی ہے کہ اسے مستقبل کی حیثیت دے کر اس مستقبل کی بہتری میں قیمتی وقت اور قیمتی توانائیاں صرف کی جائیں۔

جس طرح ایک مزدور چند گھنٹے کام کرنے کے بعد معاوضہ لے کر چلا جاتا ہے، اسے روزانہ کی مزدوری سے زیادہ کام کرنا نہیں ہوتا، چاہے اسے مزید کام کرنے کی پیشکش ہی کیوں نہ کی جائے۔ اس لئے کہ اس نے اپنا ایک معیار زندگی متعین کیا ہے، وہ اس سے زیادہ کا حریص نہیں ہوتا۔

ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ وہ چھ ماہ میں ایک ماہ محنت مزدوری کرتے تھے، اور ایک ماہ کی کمائی سے چھ ماہ کا گذارہ کرتے تھے، وہ باقی وقت عبادت اور ذکر وفکر میں صرف فرماتے تھے۔

ایک خدا ترس فرد کے لئے دنیا کے حوالے سے یہی لائحہ عمل ہونا چاہئے کہ تھوڑی سی محنت سے کچھ آمدنی حاصل ہوئی، اس کے بعد کمائی سے دستکش ہوکر تہذیب نفس کے کاموں میں مصروف ہونا چاہئے، اس لئے کہ تہذیب نفس اور تزکیہ نفس، عبادت وذکر وفکر اور صالح ماحول میں رہنے کے لئے وقت دیئے بغیر نہیں ہوسکتا اور تہذیب نفس کے بغیر نفسی قوتوں سے نجات حاصل کرکے اللہ کی رضا کے مطابق زندگی گذارنا دشوار تر ہے۔

جب تک فرد دنیاوی سامان کے حوالے سے اپنی آرزوؤں اور خواہشات کو کم کرنے اور کم سے کم دنیا پر راضی رہنے کا سلیقہ نہیں سیکھتا، تب تک وہ نہ تو مادی تفکرات سے نجات حاصل کرسکتا ہے اور نہ ہی اس کے لئے قیمتی وقت کے صحیح استعمال کی صورت پیدا ہوسکتی ہے۔

جب ساری زندگی دنیا میں صرف ہوکر توانائیاں جواب دینے لگتی ہیں تو دیکھا گیا ہے کہ فرد ساری زندگی جس نہج پر زندگی گذارتا رہا ہے، زندگی کا وہ نہج، عادات بد کی صورت میں عبادت وذکر وفکر سے غفلت کے استحکام کی صورت میں سامنے آتا ہے اور عادتوں کی زنجیر اتنی

مضبوط ہوجاتی ہے کہ نئی گہری دینی ومذہبی زندگی شروع کرنے اور تہذیب نفس کی طرف آنے کے راستے ایک طرح سے بند ہوجاتے ہیں۔ ساری کوششوں کے باوجود آخری عمر میں زیادہ سے زیادہ فرد کچھ مذہبی مراسم کی ادائیگی تک محدود ہوجاتا ہے۔ سستی وغفلت اور دنیا پرستی کی عادتوں سے نجات حاصل کرنے اور تہذیب نفس کا اصل وقت نوجوانی کا ہے۔ اس عمر کو غنیمت سمجھکر وقت کے صحیح استعمال کی فکر کرنا چاہئے۔

تریدون عرض الدنیا واللہ یرید الآخرۃ. (تم دنیا چاہتے ہو، جب کہ اللہ آخرت کی (بھلائی) چاہتا ہے) اس آیت میں گویا عام طور پر ہر فرد کے حالات کی عکاسی کی گئی ہے کہ وہ دنیاوی زندگی کی خوشحالی کی فکر سے اوپر اٹھنے کے لئے تیار نہیں۔

موجودہ دور میں دنیا اتنا خوبصورت بن کر سامنے آئی ہے اور اس کی مصنوعی ضروریات اتنی زیادہ بڑھ گئی ہیں اور بڑھتی جارہی ہیں کہ سارا وقت اور ساری توانائیاں خرچ کرنے کے باوجود بھی ضروریات کی تکمیل نہیں ہو پاتی، اس لئے کہ ایک مصنوعی ضرورت پوری کرنے کے بعد نئی مصنوعی ضروریات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے، پھر دوست واحباب، عزیز واقارب اور محلّہ والوں کی خوشحال زندگی کو دیکھکر فرد وافراد کی دنیا کے حوالے سے آرزوؤں اور حرص میں اضافہ ہوجاتا ہے، ورنہ فرد وافراد معاشرہ میں پست ہوجانے اور پیچھے رہ جانے اور عزت وحیثیت کے کمزور ہوجانے کے خطرات سے دوچار ہونے لگتا ہے۔ اس طرح کے حالات میں معاشرہ کا مقابلہ کرتے ہوئے وقت اور توانائیوں کے صحیح استعمال اور آخرت کی دائمی زندگی کی فکر سے وہی افراد بہرہ ور ہوسکتے ہیں، جو درویشوں، دنیا سے بے نیاز اور صاحبان دل افراد سے اپنا تعلق مستحکم کرتے ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے افراد ہی کو سامان دنیا اور زینت دنیا کا وافر حصہ نہ ہونے کے باوجود سکون وسکینت کی زندگی عطا فرمائی جاتی ہے، ان کے دلوں میں دنیا سے مرعوبیت، خوف زدگی، دنیا کی دھشت اور اس کی ہیبت کو نکال دیا جاتا ہے، اور سادہ زندگی ہونے کے باوجود وہ وجدانی طور پر اپنے آپ کو سب سے

زیادہ خوش نصیب سمجھنے لگتے ہیں۔

دنیا کے تفکرات دراصل آخرت کے تفکرات سے دوری ہی کا نتیجہ ہوتے ہیں، اس سلسلہ میں یہاں دو احادیث پیش کی جاتی ہیں۔

حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ حضورﷺ نے فرمایا: جو لوگ اللہ کی رضا کے طالب ہوں اور اس سلسلہ میں لوگوں کی ناراضگی کی پرواہ نہ کریں تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی پوری مدد فرماتا ہے۔ ان کو لوگوں کی ناراضگی سے نقصان پہنچنے نہیں دیتا۔ جو لوگ اللہ کو ناراض کرکے لوگوں کی خوشنودی چاہتے ہیں تو اللہ، ان سے اپنی مدد کا ہاتھ کھینچ لیتا ہے اور ان کو لوگوں کے حوالہ کردیتا ہے، جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی نصرت سے بھی محروم ہوجاتے ہیں۔ اور جن کی خوشنودی کیلئے اللہ کو ناراض کیا تھا ان کی مدد بھی نہیں ملتی۔ (ترمذی شریف)

رسول اللہﷺ نے فرمایا، جو شخص دنیا کو نصب العین بنائیگا، اللہ اس کے دل کا اطمینان وسکون چھین لیگا اور وہ ہر وقت مال جمع کرنے کی حرص واحتیاج میں مبتلا رہیگا۔ لیکن اسے دنیا کا اتنا ہی حصہ ملیگا، جتنا اس کے مقدر میں ہوگا اور جن لوگوں کا نصب العین آخرت ہوگی، اللہ تعالیٰ ان کو قلبی سکون عطا فرمائیگا اور ان کے قلب کو مال کی حرص سے محفوظ رکھیگا اور دنیا کا جتنا حصہ اس کے مقدر میں ہوگا، وہ ان کو ضرور ملیگا۔

(۷۴) سارے بزرگانِ دین کی تصریحات یہ ہیں کہ نفس جیسے پہاڑ کی موجودگی میں، دل تک رسائی اور محبوب تک رسائی ممکن نہیں، اس لئے قرآن میں ذکر کی سب سے زیادہ تاکید ہے، انبیاء کرام تک کو یہ تاکید فرمائی گئی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا جارہا ہے۔

اذھب انت واخوک بآیاتی ولاتنیا فی ذکری.

(تم اور تیرے بھائی فرعون کے پاس جاؤ، میری آیتیں لے کر، لیکن کہیں میرے ذکر

سے غافل نہ ہونا)۔

آج کل پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر کے انہیں زمین کے مطابق ہموار کرنے اور اس سے روڈ نکالنے کے لئے بڑی طاقتور مشینیں وجود میں آ گئی ہیں۔ نفس کے پہاڑ کو زیر کرنے اور اس کی قوتوں کو مضمحل کرنے کا کثرت ذکر کے علاوہ کوئی طریقہ وجود میں نہیں آ سکا ہے اور نہ ہی وجود میں آ سکتا ہے، اس لئے کہ اللہ، جس نے انسانی شخصیت تخلیق کی ہے۔ اس نے اس شخصیت کی تعمیر اور اس کی اصلاح کے لئے ذکر ہی کا طریقہ بتایا ہے **یاایھاالذین اٰمنوا الذکر اللہ ذکرا کثیرا.** (اے ایمان والو اللہ کا کثرت سے ذکر کرو)۔

واذکر اللہ کثیرا لعلکم تفلحون. (اللہ کا کثرت سے ذکر کرو تا کہ تم فلاح پا سکو)۔

یعنی ذکر کی یہ خاصیت بیان فرمائی گئی ہے کہ وہ فلاح ونجات کا ذریعہ ہے۔

(۷۵) راہ سلوک میں خود رائی سے کام لینا یعنی اپنے لئے اپنی مرضی سے ذکر تجویز کرنا یا اوراد کے معمولات تجویز کرنا وغیرہ سخت مضر ہے۔ ایسا سالک، جو دماغی اور اعصابی کمزوری کا شکار ہے، اس کے لئے کثرت ذکر نقصان دہ ہے۔ اس سے وہ شدید اعصابی تکان کا شکار ہو کر کام سے رہ جائے گا، بالخصوص خواتین، جو مردوں کے مقابلہ میں زیادہ کمزور ہوتی ہیں۔ وہ اگر ذوق وشوق میں آ کر ذکر کے دورانیہ میں اپنی مرضی سے اضافہ کریں گی تو وہ دو چار سال میں ہی جسمانی طور پر شدید نڈھال ہو جائیں گی۔

اس لئے راہ سلوک میں چلنے کے لئے روحانی استاد کے مشوروں کو فیصلہ کن اہمیت حاصل ہے۔ البتہ ایسے طالب جو صحتمند ہیں، توانائیوں کے حامل ہیں، وہ اگر اللہ کی دی ہوئی صحت وتوانائیوں سے کام لے کر رفتہ رفتہ ذکر کے دورانیہ میں اضافہ نہیں کریں گے اور ذکر کو یومیہ دو ڈھائی گھنٹہ تک نہیں پہنچائیں گے تو ان کی ترقی متاثر ہوگی اور ان کے لئے تہذیب نفس کا عمل دشوار تر ہو جائے گا۔

(۷۶) راہ سلوک کی سب سے بڑی دشواری، جو طالب کے لئے زندگی کے ہر موڑ پر

تشویش کا موجب بنتی ہے، وہ اس کی حالت سکر ہے، جو اسے مسلسل بے قرار رکھتی ہے۔ ذکر اور مسلسل ذکر یا اہل اللہ کی صحبت یا ان کی کتابوں کے مطالعہ کے بغیر اس کی تسکین کے راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ وہ عرصہ تک کیفیات کے ادل بدل میں رہتا ہے۔ اسے حلاوت ہوتی ہے تو وہ بھی بے پناہ ہوتی ہے اور جب قبض ہوتا ہے تو وہ بھی شدید تر ہوتا ہے۔

اس کا دل، دنیا واہل دنیا سے ایک طرح سے اچاٹ سا ہو جاتا ہے۔ خلاف شرع کاموں سے اس کے دل کا نظام بُری طرح متاثر ہوتا ہے، بلکہ اس پر حجابات طاری کر کے اسے نقد سزا دیدی جاتی ہے۔

وہ دنیا میں رہتے ہوئے اور سارے ضروری کام سرانجام دیتے ہوئے بھی باطنی طور پر دوسری دنیا میں رہنے لگتا ہے، اس کی خوشی وناخوشی اور پسند وناپسند کے پیمانے عام لوگوں کے پیمانوں سے بالکل جداگانہ ہوتے ہیں۔

افراد معاشرہ کے دنیا پر ٹوٹ پڑنے کے رجحانات ومیلانات اور ان کی خلاف شرع حرکات سے وہ شدید اذیت محسوس کرتا ہے۔ اور وہ اس احساس کا حامل ہو جاتا ہے کہ کاش کہ میرے پاس طاقت ہوتی تو بُرائی کی طاقتوں کے قلع قمع کی کوشش کرتا، یہ طاقت نہ ہونے کی وجہ سے وہ ملول ہو کر رہ جاتا ہے۔ گفتگو برائے گفتگو سے اسے شدید اذیت ہوتی ہے۔ ذکر، توحید، اہل اللہ کی، اللہ کے لئے فنائیت اور شریعت کے علاوہ دوسری باتوں سے اس کی قلبی مناسبت باقی نہیں رہتی، اس پر ہمہ وقت اپنی اصلاح کی فکر غالب رہتی ہے۔

وہ ہمہ وقت اپنے نفس کی طاقت سے خائف رہنے لگتا ہے کہ معلوم نہیں، یہ نامراد نفس زبان سے کون سی فضول، لایعنی بلکہ حب جاہ وحب مال کے جذبات کے زیر اثر باتیں نکلوانے کا ذریعہ بنے گا۔

اس پر عرصہ تک حیرت درحیرت کے حالات کا غلبہ رہتا ہے۔ محبوب کے جلالی وجمالی صفات کے عکس کے حالات میں رہنے کی وجہ سے اس پر خود احتسابی، فنائیت اور اپنے کچھ بھی

نہ ہونے کا احساس غالب سے غالب تر ہونے لگتا ہے۔نفس پرست اور مادہ پرست ماحول سے اس کی بیزاری قابل دید ہوتی ہے۔محبوب کے فراق کے جذبات کے زیر اثر، اس کے دل کی بے قراری انتہا پر ہوتی ہے، اور اس کی روح، محبوب کے لئے تڑپ رہی ہوتی ہے۔ وہ جتنا ذکر کرتا ہے، اس کی طلب میں اسی مناسبت سے اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ جہاں اس کی خوشی وحلاوت کے لمحات میں اضافہ ہوتا ہے، وہاں اس کے قبض و بے چینی کے لمحات اس کے لئے قیامت خیز ہوتے ہیں۔

ایک طویل عرصہ تک ان حالات میں رہنے کی وجہ سے اس پر نفس کے مکر وفریب کی ساری واردات عیاں ہونے لگتی ہے۔اور انسانی نفسیات کے حیرت انگیز تجربات ہوتے رہتے ہیں۔ وہ دل وروح کی ضروریات اور اس کی خصوصیات سے پوری طرح آشنا ہوجاتا ہے۔

جب طالب، تہذیب نفس کے قابل ذکر مقام تک پہنچنے میں کامیاب ہوتا ہے، جو محض اللہ کے فضل کا نتیجہ ہوتا ہے (غیر معمولی مجاہدے اس کا ذریعہ ہوتے ہیں) تو طالب کو حالت سکر سے حالت صحو میں لایا جاتا ہے، حالت فنا سے نکال کر حالت بقا میں لایا جاتا ہے۔اب طالب کے ان حالات میں بنیادی تغیر واقع ہوجاتا ہے، اس کے غیر معمولی مجاہدے ختم ہوجاتے ہیں۔افراد معاشرہ سے بُعد کی، اس کی روش میں تبدیلی آجاتی ہے۔اب اس کی مزید ترقی خدمت دین اور خدمت خلق کے کاموں سے ہی وابستہ ہوتی ہے۔اب اس پر دست بکار دل بیار (یعنی ہاتھ کام میں دل محبوب میں) والی حالت غالب ہوتی ہے۔اب دنیا کا بڑے سے بڑا واقعہ بھی اسے متزلزل کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا (یہ اس پر اللہ کا فضل خاص ہوتا ہے)۔

وہ دوسروں کی اصلاح کا حریص ہوجاتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ کاش، اللہ نے مجھے ایسی صلاحیت دی ہوتی کہ لوگوں کے دلوں کو اللہ کی محبت کے لئے مائل کر دیتا اور وہ محبت کی حلاوتوں سے متمتع ہوکر، محبوب حقیقی کی قدردانی کی راہ پر گامزن ہوتے۔

اس کے ظرف میں اتنی وسعت پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ لوگوں کے قصوروں کو آخری حد تک معاف کردیتا ہے۔ وہ اپنے نفس کے وسیع تر تجربات کی بنا پر لوگوں کے نفس سے خیر وبھلائی کی کم ہی امید رکھتا ہے، اس اعتبار سے وہ افراد کو قابل رحم سمجھتا ہے۔

افراد میں انسانیت کا سلیقہ آجائے، اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی کا جذبہ پیدا ہوجائے۔ دنیا میں اپنے کردار کی ادائیگی کی فکر پیدا ہوجائے، اللہ کی رضا مقصود ہوجائے، اس کی نظر میں یہ سارے معاملات تہذیب نفس سے تعلق رکھتے ہیں، تہذیب نفس کے مراحل سے گذرے بغیر افراد معاشرہ سے اس طرح کی امیدیں رکھنا لاحاصل ہے۔

اللہ کے طالب کے سفر کے جو حالات بیان کئے گئے، یہ ایسا روح افروز اور ایمان افروز سفر ہے کہ فطرت سلیمہ کے معمولی اجزاء کے حامل افراد بھی اس سفر کی روئداد سن کر متحرک ومتفکر ہوں گے اور اس راہ پر گامزن ہونے کے لئے جذبات کروٹ لئے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اپنے اولیا کی برکت سے وہ ہمیں اس سعادت کی راہ پر گامزن فرمائے۔

(۷۷) انسانی فطرت میں موجود سب سے طاقتور داعیہ جو موجود ہے، وہ اپنے حقیقی خالق ومالک اور مولا سے عقیدہ وتوحید کا داعیہ ہے۔اس کی عبادت وپرستش کا داعیہ ہے، اس سے والہانہ محبت کا داعیہ ہے، اس کی عظمت وتقدس کے آگے اپنے آپ کو نچھاور کرنے کا داعیہ ہے۔اس کی حسین ذات اور ساری حسین صفات سے لبریز ذات سے حالت وصال کا داعیہ ہے۔انسانی شخصیت میں موجود اصل ہستی جسے فلسفیانہ اصطلاح میں خودشعور ہستی کہیں یا مذہبی اصطلاح میں روح کہیں، اس خودشعور ہستی نے عالم امر میں مطلق خودشعور ہستی کا ایک بار مشاہدہ کیا ہے، یہ مشاہدہ کیا ہوا ہے کہ روح میں اس کی صدا اور گونج نے ہلچل برپا کردی ہے اور روح کو حالت اضطراب میں مبتلا کردیا ہے، نفس کی بے رحم مادی قوتوں نے روح میں موجود اس گونج کو دبا دیا ہے، اس کی راہ میں شدید حجابات پیدا کردیئے ہیں۔فطرت کے اصل

داعیہ کی راہ میں پیدا شدہ ان حجابات کے باوجود بڑے سے بڑے ملحد اور کافر کی یہ حالت ہوتی ہے کہ جب وہ زندگی اور موت کے بحران سے دوچار ہوتا ہے اور طوفان میں اس کی زندگی کو لاحق خطرات ہوتے ہیں تو اس کی فطرت فورا جاگ جاتی ہے اور وہ تنہا اسی ذات پاک کو مدد کے لئے پکارنے لگتا ہے۔

اس سلسلہ میں قرآن کی مختلف آیتوں میں انسان کی اس حالت کی عکاسی کی گئی ہے۔

﴿ **ترجمہ:** جب ان پر (دریا کی) لہریں سائبانوں کی طرح چھا جاتی ہیں تو وہ اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کر کے اسے پکارنے لگتے ہیں۔ پھر جب وہ انہیں نجات دیکر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو بعض ہی انصاف پر قائم رہتے ہیں اور ہماری نشانیوں سے وہی انکار کرتے ہیں جو عہد شکن (اور) ناشکرے ہیں۔ (لقمان ۳۲) ﴾

﴿ ترجمہ: اور پھر جب یہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کر کے اس سے دعا مانگتے ہیں پھر جب وہ انہیں بچا کر خشکی پر لے آتا ہے تو یہ یکا یک شرک کرنے لگتے ہیں۔ (العنکبوت ۶۵) ﴾

انسانی فطرت کی راہ میں نفس اور مادی دنیا کی پیدا کردہ ان رکاوٹوں کی وجہ سے انسان پر توحید کے اتمام حجت کی خاطر اللہ انبیاء کو مبعوث فرماتے رہے۔ رسالتمآب ﷺ کے ذریعہ اللہ نے جو کتاب مبعوث فرمائی اور جس دین وشریعت کی تکمیل فرمائی، وہ بھی فطرت میں موجود حقیقتوں کی توثیق، تائید وتفصیل پر ہی مشتمل ہے۔ اس لئے اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ بچہ دین اسلام کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر ماں باپ اسے یہودی، مجوسی یا عیسائی بنا لیتے ہیں یعنی عقیدہ توحید کی منافی راہ پر لگا دیتے ہیں۔

اگر فطرت انسانی کو صحیح طور پر کام کرنے کا موقعہ ملتا رہے اور فرد کی بچپن سے فطرت میں موجود محبوب حقیقی کی عبادت اور اس سے والہانہ محبت کے جذبات کی بنیاد پر تربیت ہوتی رہے تو فرد وافراد کے سارے فطری جذبات کی تسکین کی صورت پیدا ہوسکتی ہے اور معاشرہ اللہ

کی عبادت، اس سے محبت اور اس کی مخلصانہ اطاعت کی بنیاد پر متشکل ہو کر مثالی منظر پیش کر سکتا ہے۔

زندگی اور معاشرہ کو لاحق خطرات، طوفانوں بحرانوں اور فساد کا بنیادی سبب ہی یہی ہے کہ انسانی تخلیق کے بنیادی نصب العینی داعیہ سے بغاوت اختیار کر کے فطرت سے تصادم کی راہ اختیار کی جاتی رہی ہے، جس سے افراد کی داخلی وخارجی زندگی میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل شروع ہوتا رہا ہے اور وحدت ووحدانیت کے رنگ کے بجائے دوئی ودورنگی پیدا ہوتی رہی ہے۔

اب ہمارا کام یہ ہے کہ فطرت میں موجود اللہ سے والہانہ محبت کے طاقتور نصب العینی داعیے کو بیدار کر کے، اپنی شخصیت کو بھی خالص توحید اور دین حق کی بنیاد پر مستحکم کرنے کی کوشش کریں تو اپنی استعداد کے مطابق معاشرے کو بھی اس راہ پر لانے کے جدوجہد کریں۔ فرد وافراد کی شخصیت کا استحکام اور خود معاشرہ کی فلاح وبہبود اسی کام سے وابستہ ہے۔

محبوب حقیقی سے والہانہ محبت بندہ مومن کی سب سے بڑی خصوصیت ہے، **والذین امنوا اشد حبا للہ** (جو صاحب ایمان ہیں وہ اللہ سے شدید محبت رکھتے ہیں)۔

والہانہ محبت فرد وافراد کی ساری توانائیوں کو ایک ہی مرکزی نکتہ پر مجتمع کرتی ہے۔ والہانہ محبت دوسری ساری محبتوں کو اسی محبت کے تابع کر دیتی ہے۔

والہانہ محبت، فرد وافراد کی فداکارانہ اور سرفروشانہ اداؤں کو تیز سے تیز کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ والہانہ محبت فرد میں محبوب کے مقاصد کے لئے کام کرنے اور محبوب کے لئے زندہ رہنے اور محبوب کے لئے مرنے کا حوصلہ پیدا کرنے کا موجب بنتی ہے۔

والہانہ محبت کے بغیر افراد اور معاشرہ کی وہی حالت ہوتی ہے، جو اس وقت ہماری حالت ہے کہ مادی زندگی پر فدائیت کی ادائیں غالب ہیں۔

(۷۸) اسم ذات کا ذکر اللہ کی اتنی بڑی نعمت ہے کہ یہ ہر قسم کے نفسیاتی وذہنی امراض

کا علاج ہے، ایسے ذہنی امراض جو دماغ کی ساخت میں کمی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، ان کا علاج تو نہیں، لیکن اس کے علاوہ ہر قسم کے نفسیاتی نوعیت کے امراض کا علاج ہے۔ نفسیاتی بیماریوں میں نفسیاتی ڈاکٹروں کا علاج وقتی طور پر تو ضرور کارگر ہوتا ہے، لیکن وہ نفسیاتی بیماریوں کا مستقل حل نہیں ہے۔ ساری نفسیاتی بیماریاں روح، دل، ذہن اور نفسیات کی اس عدم تسکین کا نتیجہ ہوتی ہیں، جو محبوب حقیقی کے ذکر وانوار حسن کے سلسلہ میں ان کو لاحق ہوتے ہیں۔

دل اور روح کی، محبوب حقیقی کے لئے تڑپ اور طلب اتنی بے پناہ ہے کہ وہ محبوب کے ذکر کے بغیر رہ نہیں سکتے، ان کو ان کی مطلوبہ غذا نہ دینے کے نتیجہ میں دل، روح اور ذہن سے اضطراب اور وسوسوں کی بے پناہ لہریں اٹھتی ہیں، جو افراد کو نفسیاتی بیماریوں کی دلدل میں پھنسا دیتی ہیں، اس نکتہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے فرد وافراد زندگی بھر نفسیاتی ڈاکٹروں کے چکر لگاتے رہتے ہیں۔ ان کی دوائیں ذہن کو منجمد کر کے، وقتی طور پر ذہن سے دباؤ کم کرنے اور وقتی طور پر وسوسوں میں کمی لانے کا ذریعہ ضرور بنتی ہیں، لیکن وہ بیماری کی اصل بنیاد کو ختم کرنے کے سلسلہ میں کردار ادا کرنے سے قاصر ہیں۔

اس لئے اپنے ایسے عزیز واقارب و دوست واحباب جو نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہیں، انہیں حکمت سے یہ نکتہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ اس سلسلہ میں زندگی نفسیاتی ڈاکٹروں کا سہارا لینے کی بجائے اللہ کے ذکر کا سہارا لیں۔ اللہ کا اپنا وعدہ ہے، اور اللہ کی بات سے بڑھکر اور کس کی بات صحیح ہوسکتی ہے۔ وعدہ کیا ہے۔ **الا بذکر اللہ تطمئن القلوب**. (جان لو کہ دلوں کو سکون اللہ کے ذکر سے ہی ہوتا ہے۔) دوسری آیت میں ایسے لوگوں کے لئے ہلاکت کی وعید سنائی گئی ہے، جن کا دل اللہ کے ذکر کے لئے سخت ہے، اور دل ذکر کی طرف آنے کے لئے تیار ہی نہیں، یہ ہلاکت کے اثرات اس دنیا میں اس صورت میں ظاہر ہوتے ہیں کہ سکون وسکینت کی نعمت سلب کردی جاتی ہے۔ شدید ذہنی دباؤ کے حالات سے دوچار کردیا جاتا ہے۔ وسوسوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیا جاتا ہے، اشتعال کی نفسیات مسلط کردی جاتی

ہے۔ اور دوست، احباب اور عزیز واقارب میں دوریاں پیدا کردی جاتی ہیں۔

اس طرح کی بہت ساری سزائیں ہیں، جو ذکر سے محرومی کی صورت میں ملتی ہیں۔

اس طرح کے نفسیاتی مریضوں کا علاج یہ ہے کہ وہ روحانی استاد کی صحبت میں آتا رہے، ان سے رابطہ میں رہے۔ ان کے بتائے ہوئے ذکر کو وظیفہ بنائے اور روحانی استاد کی ہدایت کے تحت وہ ذکر کے دورانیہ میں اضافہ کرتا رہے۔

اگر نفسیاتی مریض ذہنی واعصابی طور پر کمزور ہے تو اس کا علاج کسی بہترین حکیم سے کرائے، تاکہ اعصابی کمزوری اس کے ذکر کی راہ میں حائل نہ ہوسکے۔

قلبی ذکر ہر طرح کی نفسیاتی بیماریوں کا یقینی اور کامل علاج ہے، ڈاکٹروں کی دوائیاں یا ان کے نفسیاتی مشوروں کی حیثیت ان ٹافیوں سے زیادہ نہیں، جو بچوں کو وقتی طور پر خوش کرنے کے لئے دی جاتی ہیں۔

ہم نے ایسے بیسیوں مریض دیکھے ہیں، جو بیچارے زندگی کا بیشتر حصہ بیماریوں میں گذارتے رہے ہیں اور نئے نئے نفسیاتی ڈاکٹروں سے رجوع ہوتے رہنا، ان کے معمولات کا حصہ ہوگیا ہے۔ ہر ڈاکٹر کی دوا سے انہیں وقتی فائدہ ضرور ہوتا ہے، لیکن مکمل افاقہ نہیں ہوتا۔

بعض شدید نفسیاتی مریضوں نے ہمارے مشورہ سے اسم ذات کا ذکر شروع کیا اور اس ذکر کو دو ڈھائی گھنٹے تک پہنچایا، الحمدللہ انہیں مکمل افاقہ ہوا۔

جدید نفسیاتی طریقہ علاج دراصل مادہ پرست مغربی انسان کے لئے ایجاد ہوا ہے، جو خدا اور مذہب پر اعتقادی یقین سے مکمل طور پر محروم ہو چکا ہے جب کہ ہمارا معاشرہ خدا پر یقین رکھتا ہے۔ خدا پر یقین رکھنے والے افراد معاشرہ کے لئے اللہ کے ذکر میں ہی وہ شفا موجود ہے کہ اس سے دل، نفسیات اور روح کے سارے احساسات کی پاکیزگی اور ان کی تسکین وتشفی ہوجاتی ہے۔ اس مجرب ترین علاج کو چھوڑ کر، مادہ پرست مغرب کی تقلید میں مادہ پرست مغربی انسان کے تیار کردہ علاج کی طرف زندگی بھر رجوع ہونا دانائی ہرگز نہیں۔

بدقسمتی سے ہمارے مغربی طرز نفسیات کے مسلم ماہرین کا بھی عام طور پر انسانی نفسیات کے بارے میں کل علم وہی ہے، جو انہیں مغرب کے مادہ پرست ماہرین نفسیات سے ملا ہے۔

اگر مسلم نفسیات کے بارے میں ان کا مطالعہ ہوتا تو انہیں اندازہ ہوتا کہ صدیوں سے مسلم نفسیات کے ماہرین، صحبت اور ذکر سے ہی نفسیاتی بیماریوں کا علاج کرتے آئے ہیں۔

اہل اللہ سے صحبت ورابطہ رکھنا، ان کے بتائے ہوئے ذکر کے معمولات کو جاری رکھنا، ذہنی اعصابی کمزوری کے لئے تجربہ کار یونانی حکیم کا تجویز کردہ نسخہ استعمال کرنا اور روزانہ صبح وشام آدھے آدھے گھنٹے کی تفریح کو معمول بنانا یہ جملہ نفسیاتی بیماریوں کا کافی وشافی علاج ہے۔ چھ ماہ تک ان چیزوں کو اختیار کرنے سے غیر معمولی مثبت نتائج ظاہر ہوں گے اور پھر ذکر کو زندگی کا معمول بنانا پڑے گا۔

ویسے بھی بندہ مؤمن کی زندگی ذکر سے ہی وابستہ ہے۔ ذکر کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں۔ ایسی زندگی حیوانوں سے بدتر ہوجاتی ہے۔ یہ زندگی کھانے پینے ایک دوسرے سے تصادم کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔

(۷۹) معاشرہ میں دعوتی کام کی بھی سخت ضرورت ہے، باصلاحیت افراد کو اس سلسلہ میں آگے بڑھکر کام کرنا چاہئے، لیکن دعوتی کام کے لئے حکمت وفراست کی بھی سخت ضرورت ہے۔ حکمت وفراست سیکھنے کے لئے کچھ وقت نکالنا چاہئے۔

دعوتی کام میں یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ مدعو سے گفتگو کرتے ہوئے کہیں میری زبان سے ایسے جملے ادا نہ ہوجائیں، جو فرد کی نفسیات پر منفی تاثر چھوڑنے کا ذریعہ ثابت ہو۔ نیز مدعو سے میرا رویہ اور کردار ایسا ہو، جو آداب وشائستگی سے آراستہ ہو۔ اس طرح کی صلاحیت کے ذریعہ ہی معاشرہ میں دعوت کے نفوذ کی راہیں پیدا ہوسکتی ہیں۔ دوسری صورت میں دعوتی کام کا نتیجہ افراد کو مزید دور کرنے کی صورت میں ہی نکل سکتا ہے۔

فرد کی نفسیات اتنی پیچیدہ ہے کہ فرد کی گفتگو اور طرز عمل کے اثرات مزاج میں کافی دیر تک غالب رہتے ہیں، اگر گفتگو اور رویے میں مدعو کی شخصیت اور اس کے مزاج کے خلاف معمولی بات بھی صادر ہوئی اور دوچار بار اس طرح ہوتا رہا تو اس سے مدعو کی نفسیات میں تلخیاں اور رنجیدگیاں شامل ہوجائیں گی اور قربت کے بجائے مزید دوری پیدا ہوتی جائے گی، دعوت کا وہی کام کارگر ہوسکتا ہے، جس میں افراد کی نفسیات کو سمجھکر، اس کے مطابق حکمت اور سلیقہ سے افراد سے تعلقات استوار کرنے، اس طرح ان تک دعوت پہنچانے کی کوشش کی جائے۔

افراد کی نفسیات کے فہم کی بہتر صورت یہی ہے کہ فرد خود اپنی نفسیات اور اپنے نفس کے سدھارے واصلاح کے عمل سے گذر کر، نفس کی طاقتور منفی قوتوں کا بتدریج مشاہدہ کرتا رہے، جب وہ نفسی قوتوں کے مشاہدہ کے عمل سے گذرے گا تو نفسیات میں موجود ساری خرابیاں اس پر آشکار ہوتی جائیں گی اور افراد کی منفی گفتگو اور منفی کردار کے اثرات، اس کے اپنے مزاج پر کس نوعیت کے پڑھ رہے، اور اس کے نتیجہ میں افراد سے ٹکراو کے خیالات ووسوں سے اس کا کس طرح احاطہ کرتے رہے، نیز جب وہ اصلاح کے مراحل میں کچھ آگے بڑھتے رہے تو افراد کی منفی باتوں ومنفی رویوں کے سلسلہ میں اس کے احساسات میں کس طرح تبدیلی پیدا ہوتی رہی۔ یہ عملی تجربہ ومشاہدہ ہی داعی کو حکمت وسلیقہ سے دعوتی کام کرنے کی استعداد سے بہرہ ور کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دعوتی کام کا تعلق نہ تو کتابی علم سے ہے اور نہ ہی کچھ دنوں کے تربیتی پروگرام میں شریک ہوکر، دعوتی کام کی صلاحیت کے حصول سے ہے، بلکہ اس کام کا سارا تعلق اس عملی تجربہ گاہ میں بھرپور شرکت سے ہے، جس سے آتش عشق میں جل کر نفس کی حیوانی وجبلی قوتوں اور اس کے مکر وفریب کے بے پناہ حربوں سے گذرنا پڑتا ہے۔

اس عملی تجربہ گاہ سے گذرے بغیر قیل وقال اور علمی گفتگو کے ذریعہ جو دعوتی کام ہوگا،

وہ نہ تو دیرپا و پائدار ثابت ہوگا اور نہ ہی اس میں اخلاص کے بھرپور اجزاء شامل ہوں گے، اس طرح کے دعوتی کام کے نتیجہ میں نااتفاقیاں، ناراضگیاں، رنجیدگیاں، اور تلخیاں جنم لیتی رہیں گی، جو افراد کو ایک دوسرے سے مزید دور کرنے کا ذریعہ بنتی رہیں گی۔

عملی تجربہ گاہ سے گذرنے کے نتیجہ میں جو دعوتی کام ہوگا، اس میں داعی مدعو کے سامنے اپنی کردہ وناکردہ حرکتوں کے بارے میں دل کی گہرائیوں سے معذرت کرکے، اپنی مسکراہٹوں سے اس کا دل جیتنے کا ذریعہ بنتا رہے گا۔ اور داعی، مدعو کی، اپنے مزاج کے خلاف سخت سے سخت باتیں سننے اور برداشت کرنے، بلکہ اس سے مزید محبت کرنے کی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہوگا۔ قرآن میں رسول اللہ ﷺ سے فرمایا جارہا ہے۔

فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظا غليظ القلب لاانفضوا من حولك. (آل عمران ۵۹)

(اللہ کی رحمت سے آپ ان کے لئے نرم مزاج واقع ہوگئے ہیں اور اگر آپ بدخو اور سخت دل ہوتے تو یہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے)۔

ادفع بالتی هی احسن فاذالذی بینک وبینه عداوة كانه ولی حمیم. (حم السجدہ آیت ۳۴)

(آپ بُرائی کو (اس انداز سے) دور کریں جو بہترین ہو، تو یکا یک کہ وہ شخص کہ آپ کے درمیاں اور اس کے درمیاں عداوت تھی، (ایسے ہوجائے گا) گویا وہ جگری دوست ہے)۔

اس سے میرا مقصود یہ ہرگز نہیں ہے کہ فرد اصلاح نفس کے ابتدائی مراحل میں دعوتی کام بالکل ہاتھ میں نہ لے، بلکہ مقصود صرف یہ ہے کہ افراد معاشرہ پر دعوتی کام کے صحیح اور حقیقی اثرات اسی وقت مرتب ہوسکتے ہیں، جب فرد کی شخصیت پر خود صبغۃ اللہ (اللہ کا رنگ) کسی حد تک غالب ہوگا اور اس رنگ کے غلبہ کی وجہ سے اس کی باتوں میں حلاوت وکشش ہوگی، اور

اس کا کردار لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے کا ذریعہ بنے گا۔

اپنی شخصیت پر صبغۃ اللہ (اللہ کے رنگ) کو غالب کرنے کا کام دشوار اور مشقت طلب ضرور ہے، لیکن دعوتی کام کا شعور وجذبہ رکھنے والے افراد کو اصلاح نفس کی اس عملی تجربہ گاہ میں شرکت کے چند ماہ کے اندر اندر احساس ہوگا کہ ان کی دعوتی استعداد میں پہلے کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ اضافہ ہوگیا ہے اور افراد کو ساتھ لے کر چلنے اور ان کی الٹی سیدھی باتوں کو برداشت کے حوصلہ میں بھی زیادتی آئی ہے۔

(۸۰) بعض طالبوں کا کہنا ہے کہ اللہ کی راہ محبت اور ذکر وفکر کی راہ سخت، کٹھن اور دشوار گذار ہے، کوئی ایسا مختصر راستہ ہو، جس میں مجاہدوں کے بغیر اصلاح نفس کی صورت پیدا ہوجائے۔

بات یہ ہے کہ اصلاح نفس کی جو بھی صورتیں ہیں، وہ سب مشکلات سے بھری ہوئی ہیں اور نفس کو مجاہدات کی بھٹیوں سے گذارے بغیر نفس کی اصلاح ممکن نہیں۔

اصلاح نفس کی ایک صورت یہ ہے کہ فرد قرآن شریف سے مستقل تعلق قائم کرے، اس تعلق کے ذریعہ قرآن میں موجود نور کو اخذ کرنے کی کوشش کرے، اس وقت تک قرآن کی گہرائیوں میں ڈوبتا رہے، جب تک نفسی قوتوں کی شہ زوری میں کمی آئے اور اللہ سے ملاقات اور حساب کتاب کا منظر دل پر غالب نہ ہوجائے۔ اس میں اتنی احتیاط ضروری ہے کہ قرآن میں غوطہ زنی کے ذریعہ اس مقام تک رسائی سے پہلے دوسروں کو قرآن سناتے رہنے اور دعوت کے کام کو ہدف بنانے سے احتراز کرے، اس لئے کہ ایسا کرنے سے زعم اور تکبر پیدا ہونے کے خطرات موجود رہتے ہیں۔

اصلاح نفس کی دوسری صورت یہ ہے کہ فرد ہمت وحوصلہ سے کام لے کر اللہ کے بندوں کی خدمت کے کام کو وظیفہ بنائے، غریبوں، مسکینوں، غلط مقدمات میں پھنسے ہوئے افراد اور اسپتالوں میں پڑے ہوئے بے سہارا مریضوں کی خدمت کے کام کو ہدف بنائے۔

اس کام میں محض اللہ کی رضامندی کا جذبہ شامل ہو اور خود احتسابی اور مستعدی سے یہ کام کرتا رہے۔ اپنی آمدنی کا ایک معقول حصہ اس کام میں صرف کرے۔ اس کام سے بھی ان شاء اللہ، اللہ کا فضل شامل ہوگا اور اصلاح نفس کی صورتیں پیدا ہوتی جائیں گی۔

تیسری صورت یہ ہے کہ خود احتسابی کے ساتھ اپنی استعداد کے مطابق چھوٹے پیمانے پر دعوتی کام کرتا رہے اور اس دعوتی کام میں ہونے والی مخالفت کو برداشت کرے اور اس کا حوصلہ پیدا کرے۔ اس دعوتی کام میں خود احتسابی کا ہونا ضروری ہے، تاکہ دوسروں کی اصلاح کے کام میں غلطاں ہونے سے اپنی اصلاح سے بے نیاز نہ ہو جائے، اس کام کے ہر موڑ پر اللہ سے اپنی اصلاح کی دعا کرتا رہے اور اس کے لئے غیر معمولی طور پر فکر مند رہے۔

اگرچہ اصلاح کا یہ طریقہ خطرات سے خالی نہیں، اس لئے کہ اپنی اور دوسروں کی نفسی قوتوں کی ناآشنائی کی وجہ سے دعوتی کام کے نام پر فرد دوسروں سے الجھاؤ اور ٹکراؤ سے دوچار ہوگا اور اس سے بچاؤ مشکل ہے۔ تاہم اگر فرد میں دعوتی کام کا جذبہ موجود ہے تو خود احتسابی کے ساتھ یہ کام کرتا رہے۔ ان شاء اللہ اس سے اپنی اصلاح کی بھی کچھ نہ کچھ صورتیں پیدا ہوتی جائیں گی۔

اصلاح نفس اور تہذیب نفس کی سب سے بہتر اور مؤثر صورت وہی ہے، جو صدیوں سے سلف میں مروج رہی ہے کہ صالحین سے وابستہ ہو کر، فرد اپنا دل ان کے سپرد کر کے، ان کا بتایا ہوا ذکر و فکر کرتا رہے یا اصلاح کے لئے وہ جو بھی جسمانی مجاہدے تجویز کریں، اس پر عمل کرتا رہے۔

صالحین کی صحبت سے نفس کی قوتیں فرد پر از خود آشکار ہوتی رہیں گی اور ان کی بتدریج اصلاح کی صورتیں بھی پیدا ہوتی جائیں گی۔ اس طرح فرد ایک تو اپنے نفس کے مدوجزر سے پوری طرح آشنائی کی وجہ سے افراد معاشرہ کی نفسیات سے باخبر ہوگا۔ اس سے دعوتی کام میں اسے آسانی ہوگی۔ دوم یہ کہ ان مراحل سے گذرنے کے بعد اس کی زندگی کا ہدف اللہ کی

رضامندی کے سوا دوسرا کوئی ہدف نہ ہوگا۔ ہر وہ کام، جو اللہ کی رضامندی کا ذریعہ ہوگا، وہ بخوشی سرانجام دینے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوگا اور اللہ کی ناراضگی والے کام سے بچنے کا نہ صرف خصوصی اہتمام ہوگا، بلکہ اس سلسلہ میں اس کی حساسیت بھی بڑھ جائے گی۔

اصلاح نفس اور تہذیب نفس کی یہ جو راہیں بتائی گئیں، وہ آسان نہیں، بلکہ مشکلات سے بھری ہوئی ہیں۔ مشکلات سے گھبرا کر، اصلاح نفس کے کام سے راہ فرار اختیار کرنا، یہ دراصل نفس کا سب سے بڑا حربہ ہے۔ نفس و شیطان انسانوں کی بہت بڑی اکثریت کو اصلاح نفس کی راہ میں حائل ہونے والی مشکلات اور دشواریوں کا خوف دلا کر، اس راہ سے دور کرتا رہا ہے، اس طرح انسانوں کی بہت بڑی اکثریت سعادت دارین سے محروم رہی ہیں۔

زندگی کا مقصد اللہ کی عبادت ہے اور عبادت کی ساری صورتیں نفس پر بہت زیادہ بھاری ہیں۔ جب تخلیق کا مقصد ہی عبادت، ذکر و فکر اور زندگی کے ہر معاملہ میں اللہ و رسول کی اطاعت ہے تو تخلیقی مقصد کے لئے مجاہدوں سے فرار کیوں ہو؟

نفس آسانی چاہتا ہے، جب کہ اللہ کی محبت اور اس کی اطاعت، نفسی قوتوں کو پامال کرنے کے لئے غیر معمولی مجاہدوں کی متقاضی ہیں۔ مجاہدوں کے بغیر نفس کے مزاج اور اس کی ''خصوصیات'' میں تغیر پیدا ہونا، اور اللہ و رسول کی اطاعت کا آسان ہونا، نہ صرف دشوار ہے بلکہ دشوار تر ہے۔

قرآن میں ہے۔

احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا امنا وھم لایفتنون. (کیا لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ یہ کہنے سے چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور انہیں آزمایا نہیں جائے گا۔)

یہاں تو قدم قدم پر آزمائش ہے۔ ایک طرف نفس اور مادی دنیا کے تقاضے ہیں، دوسری طرف اللہ و رسول کے تقاضے ہیں۔ رحمانی اور نفسی و شیطانی قوتوں کے درمیاں شدید معرکہ آرائی کے بغیر نہ تو فرد مہذب ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کے لئے اللہ و رسول کی اطاعت

آسان ہوتی ہے اور نہ ہی باطنی خرابیوں سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے۔

وقال الذین کفروا لولا نزل علیه القرآن جملة واحدة کذالک لنثبت فوادک ورتلناه ترتیلا. (الفرقان۳۲)

(اور کافر کہتے ہیں کہ ان پر قرآن ایک ہی بار کیوں نہیں اتارا گیا۔ اس طرح (آہستہ آہستہ) اس لئے (اتارا گیا ہے) تاکہ اس سے آپ کے دل کو مستحکم رکھیں اس لئے ہم اسے ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے ہیں)۔

قرآن میں ایک اور جگہ ہے۔ **انلزمکموها وانتم لها کارهون.** کیا تمہارے نہ چاہنے کے باوجود (ایمان کی یہ دولت) ہم تمہارے گلے مڑھ دیں۔

یعنی اسلام کے لئے فرد میں نہ تو حقیقی طلب موجود ہو اور نہ ہی اس کے لئے وہ قابل ذکر وقت نکال سکے، جب کہ دنیا کے سارے کاموں کے لئے اس کے پاس وقت موجود ہو۔ وقت کا عذر صرف اور صرف عبادت وذکر وفکر اور اللہ کی محبت کو فروغ پذیر دینے کے سلسلہ میں ہے۔

یہ اللہ کی سنت کے خلاف ہے کہ فرد وافراد کی اس طرح کے صورتحال میں اسے سعادت دارین کی راہ حاصل ہو۔

(۸۱) انسانی شخصیت میں دل کو جو فیصلہ کن اہمیت حاصل ہے، وہ اس وجہ سے ہے کہ وہ انوار الٰہی کے اخذ کا ذریعہ ہے۔ جب کہ عقل کی حیثیت مادی ہے، وہ انوار الٰہی کے اخذ کی صلاحیت سے قاصر ہے، وہ افراد، جو دل کی ان صلاحیتوں کی بیداری کی طرف نہیں آتے، وہ چاہے کتنے ہی بڑے دانشور واہل علم ہوں، وہ محبوب کے لئے دل کی بے چینی اور ذکر وفکر اور عبادت میں استغراق کے نتیجہ میں دل کو حاصل ہونے والی حلاوتوں سے نہ تو متمتع ہوتے ہیں اور نہ ہی آشنا۔ ایسے افراد قابل رحم ہیں، وہ ساری زندگی عقل ہی کو حرف آخر سمجھکر عقل کے پیمانوں سے سوچنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ان کی گفتگو اور تحریر میں دل کی حلاوتیں ومسرتیں

(جو گہری عبادت وعبدیت کے رنگ سے حاصل ہوتی ہیں) موجود نہیں ہوتی، ان میں خشکی غالب ہوتی ہے، وہ افراد کے لئے دلی کشش کا ذریعہ نہیں بنتے۔

عقل کی سرحدوں سے اوپر اٹھکر دل کی سرحدوں تک پہنچے بغیر نور ایمان تک رسائی اور سیرت وکردار میں پاکیزگی اور اپنے عمل سے خوشبو پھیلانے کا رنگ پیدا ہونا بعید تر بات ہے۔ یہ وہ اہم نکتہ ہے جسے سمجھنا ضروری ہے۔

دل کی قیمت پر عقل کی صلاحیتوں کو بیدار اور طاقتور بنانا سخت نقصان کا سودا ہے۔ عقل کی حیثیت اپنی جگہ، لیکن احساسات، جذبات اور امنگوں کا مرکز تو دل ہی ہے۔ جذبات اور احساسات کے اس مرکز تک پہنچ کر اسے محبوب حقیقی کی محبت کا مرکز بنائے بغیر عقل کو سلامتی کے اجزا بھی حاصل نہیں ہوتے۔

ایسی عقل اگر اسلامی علوم سے بہرہ ور ہو بھی تو وہ دل کی حلاوتوں ومسرتوں سے بے بہری اور باطن میں موجود رذائل کے زیر اثر حقیقت ایمانی کے فہم اور اس کی فروغ پذیری کا ذریعہ بن سکے، مشکل تر کام ہے۔ اس لئے ایسے ظاہری علوم کے حاملین جو ریاضتوں کے ذریعہ دل کی سلامتی کو یقینی نہیں بناتے، ان کا علمی وعملی کام معاشرہ میں کوئی تحرک برپا کرنے کامیاب نہیں ہوتا، جب کہ قلب سلیم کے حامل افراد اپنے کردار سے افراد کی زندگیوں کے رخ کو بدلنے اور خود بھی مادیت پرستی کی طوفانی لہروں میں پہاڑ کی طرح مستحکم رہتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم قلب سلیم کے حامل افراد کی صحبتوں سے اپنے دل کی صفائی وتطہیر کے کام کو اہمیت دیں، تاکہ دل کی حقیقی حلاوتوں ومسرتوں تک رسائی میں حائل رکاوٹیں دور ہوسکیں اور نفس اور مادی عقل کی یرغمالی سے بچاؤ کی صورت پیدا ہو سکے۔

دل کی سلامتی کے لئے ہونے والے مجاہدوں کے بعد معمولی عقل اور تھوڑا سا علم بھی حکمت وفہم کے بہت سارے دروازوں کے کھلنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اس لئے کہ قرآن وسنت کی گہرائیوں تک رسائی کی راہ میں اصل رکاوٹ باطنی حجابات ہیں، جو دل کی صلاحیتوں کو

مضمحل کردیتے ہیں۔ یہ حجابات دور ہونے کے بعد دل، محبوب حقیقی کی محبت اور اس کی اطاعت کے لئے بے چین ہونے لگتا ہے۔ ایسے افراد کی زندگی کا مقصد ہی مستعدی کے ساتھ اللہ ورسول کی اطاعت اور افراد معاشرہ میں اطاعت کے رنگ کو غالب کرنے کی جدوجہد ہوتا ہے۔

(۸۲) شاہ ولی اللہ حجتہ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں، ایسے اولیا جن پر خلوت کا رنگ غالب ہوتا ہے اور جو دین کے فروغ کی جدوجہد کی طرف نہیں آتے، ان کا مقام قرب کم ہوتا ہے، بمقابلہ ان اولیائے کرام کے، جو اللہ کی محبت کے رنگ کو اپنے اوپر غالب کرنے کے بعد، اللہ کے مقاصد کے لئے کام کرتے ہیں اور خدمت دین اور اللہ کی مخلوق کی اصلاح کے کام کو وظیفہ بناتے ہیں۔ ایسے اہل اللہ بلند مقام پر فائز ہوتے ہیں وہ ملاء اعلیٰ (یعنی فرشتوں) کی توجہ اور دعاؤں کا بھی مرکز بنتے ہیں۔

(۸۳) موجودہ دور اپنی فتنہ انگیزیوں کے اعتبار سے اتنا طاقتور ہے کہ فرد کا ایمان ہر وقت خطرے سے دوچار رہتا ہے، ہماری معیشت، معاشرت وتجارت اور سارے ریاستی نظام کی تشکیل اس طرح ہوئی ہے کہ نیکی پر قائم رہنا، تجارت میں ایمانداری کا مظاہر کرنا، سرکاری ملازم کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کرنا، دولت جمع کرنے کے جنون سے بچنا، بڑھتی ہوئی مہنگائی سے مقابلہ کرتے ہوئے جائز آمدنی پر اکتفا کرنا، جھوٹ، ملاوٹ، فریب دہی، رشوت وغیرہ سے بچنا، اپنی ذات سے دوسروں کو اذیت اور نقصان پہنچانے سے بچنا وغیرہ یہ سارے کام ایسے ہیں، جن کے لئے طاقتور ایمان کی ضرورت لاحق ہے۔ طاقتور ایمان کے بغیر مادیت پرستی کی ان طوفانی لہروں سے بچنا ممکن نہیں۔ یہ صلاحیت کثرت ذکر کے نور اور صالحین سے مستحکم تعلق کے نتیجہ میں ہی پیدا ہوسکتی ہے، اس کا اہتمام ہونا ضروری ہے، یہی نہیں، بلکہ اس کام کو دوسرے سارے کاموں پر ترجیح دینا ہوگا۔ ریاست اور معاشرہ کو جملہ فساد سے بچانے کی یہی بہتر اور مؤثر صورت ہے۔ اگر ہمارا نظام تعلیم صحیح خطوط پر کام کررہا ہوتا تو

معاشرہ میں موجودہ اخلاقی تباہی اور بحران کی صورت پیدا نہ ہوتی، لیکن تعلیمی نظام کی ابتری کے بعد صالحین سے تعلق ہی وہ واحد صورت ہے، جس سے ہر طرح کے اجتماعی فساد سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوسکتی ہے۔

(۸۴) راہ سلوک میں اکثر طالب وہ ہیں، جو کنارے کنارے پر چلنا چاہتے ہیں یعنی وہ آتش عشق میں جل کر نفس کو مہذب بنانے کی راہ باقائدہ اختیار کرنا نہیں چاہتے، ان کی چاہت یہ ہوتی ہے کہ خدا بھی راضی رہے تو نفس بھی، آخرت بھی بہتر ہو تو ساتھ ساتھ افراد معاشرہ سے نبھانے کی صورت بھی موجود رہے۔ اور زمانہ اور حالات کا ساتھ بھی نہ چھوٹے۔ اور زمانہ سازی کی ساری چیزیں بھی موجود ہوں، سکون قلب کی نعمت بھی حاصل ہو تو دولت کمانے کی جدوجہد میں کمی بھی نہ آنے پائے، ایسے طالبوں کی علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ ذکر کا باقائدہ اہتمام نہیں کرتے، کبھی کرتے ہیں کبھی نہیں۔ وہ صحبت اور تعلق قائم کرنے سے بھی گھبراتے ہیں، اس لئے کہ انہیں خطرہ رہتا ہے کہ صحبت کے تسلسل سے کہیں وہ دنیا اور معاشرہ سے کٹ نہ جائیں اور اور خواہشات نفس کمی کی صورت نہ پیدا ہوتی جائے۔

کنارے کنارے پر رہنے کی طالبوں کی یہ روش ان کے لئے باعث خطرہ ہے کہ وہ معاشرہ کا حصہ بن کر اس راہ سے مکمل طور پر منقطع نہ ہوجائیں۔

روحانی استاد کی آرزو اور کوشش ہوتی ہے کہ ایسے طالب ہمت وحوصلہ سے کام لے کر باقائدہ ذکر وصحبت کا اہتمام کریں، تاکہ وہ سعادت دارین کی راہ پر پوری طرح گامزن ہوں، لیکن روحانی استاد کی محض آرزوؤں اور دعا سے کچھ نہیں ہوتا، جب تک فرد وافراد میں خود اصلاح کی حقیقی طلب اور تڑپ پیدا نہ ہو۔

(۸۵) راہ سلوک میں مستعدی کے ساتھ چلنے والے طالب کو دو چیزوں کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔ (جو اس کے لئے تشویش کا موجب ہوتا ہے) ایک یہ کہ کہیں وہ نفس اور مادی ماحول کے زیر اثر اس راہ سے محروم نہ کردیا جائے اور اس سے یہ راہ سلب نہ ہوجائے۔

دوسری چیز، جس کی اسے فکرمندی لاحق ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ اسے جو کچھ ملنا ہے، وہ جلد مل جائے، اس میں تاخیر نہ ہو۔ اس کی کیفیات میں جلد سے جلد بہتری پیدا ہو، وہ جلد سے جلد حالت سکر سے حالت صحو میں آ جائے نیز نفس کو ضابطہ میں لانے کے سلسلہ میں اس کے مجاہدوں کا دورانیہ کم سے کم ہو جائے۔

راہ سلوک میں چلنے والے حقیقی طالب کو یہ دونوں خیالات گھیرے رہتے ہیں، لیکن اس کے مجاہدوں کا دورانیہ جوں جوں بڑھنے لگتا ہے اور وہ کچھ وقت صبر واستقامت سے چلتا رہتا ہے تو اس سلسلہ میں اس کے اضطراب، تشویش اور فکرمندی میں آہستہ آہستہ کمی آتی جاتی ہے۔ اور اس کے سکون کے دورانیہ میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ذکر وفکر کے مجاہدوں سے اس پر یہ نکتہ از خود واضح ہونے لگتا ہے کہ تہذیب نفس کی راہ میں ہونے والی ان ساری مشکلات اور تاخیر میں بڑی حکمتیں پوشیدہ ہیں۔

جو نعمت آسانی سے ملتی ہے، اس کی بے قدری ہوتی ہے اور بے قدری فرد کو ناشکری کی طرف لے جاتی ہے۔ اور ناشکری کا نتیجہ محرومی اور سزا کی صورت میں ہی ظاہر ہوتا ہے۔

حقیقی طالبوں کو دوران مجاہدہ مولانا رومی کے بیان کردہ اس نکتہ کا استحضار کرنا چاہئے کہ طالب کو راہ محبت وراہ سلوک کی سعادت عطا فرما کر، اس سے ایک زندگی چھین کر، سو نئی زندگیاں عطا کر دی جاتی ہیں۔ یعنی طالب کے دل کو دنیا سے اچاٹ کر کے، اللہ کی راہ محبت میں تیز رفتاری سے چلا کر، آگے چل کر نفس مطمئنہ کی جو نعمت عظمیٰ عطا فرمائی جاتی ہے، وہ سو نئی زندگیوں سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔

اُس وقت سالک کو اس بات کا پوری طرح ادراک ہوتا ہے کہ اسے جو سعادت عطا فرمائی گئی ہیں، وہ بہت بڑی سعادت ہے۔ اس سعادت عظمیٰ کے مقابلہ میں اس کے مجاہدے کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتے۔

(۸۶) راہ سلوک میں ایک درمیانی عرصہ ایسا ہوتا ہے، جس میں اللہ کے رنگ کو غالب

کرنے کے لئے یکسانیت کی ضرورت درپیش ہوتی ہے۔ یعنی غیر ضروری دنیاوی کاموں سے قطع کر کے متوجہ الی اللہ ہونے کے لئے یکسو ہونا پڑتا ہے۔ دل اور ذہن کی بیشتر توانائیوں کو اللہ کی محبت کے مقصد کے استعمال کی وجہ سے نفسی قوتوں پر فتحیابی حاصل کرنے میں آسانی ہوتی ہے اور راہ سلوک طے ہونے میں جلدی ہوتی ہے۔ جس طرح کسی بھی فن میں مہارت حاصل کرنے یا کاروباری استعداد پیدا کرنے کے لئے کچھ وقت اپنی بیشتر ذہنی وعملی توانائیاں صرف کرنی پڑتی ہے۔ اس کے بعد اس فن یا کاروبار کی گہرائیوں تک رسائی کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی صورت یہاں بھی ہوتی ہے کہ کچھ وقت تک بیشتر توانائیوں کے استعمال سے نفس کو مفتوح کر کے اسے اللہ کی اطاعت میں دینے اور باطنی حجابات سے بچاؤ کی بہتر صورت پیدا ہوتی ہے۔

(۸۷) سیاسی، سماجی اور معاشرتی میدان میں جو دینی افراد یا ادارے کام کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ ملت کی اہم ضرورت ہوتے ہیں۔ یہ کام کرنے والے افراد اکثر ذہین وباصلاحیت ہوتے ہیں، لیکن معرفت نفس اور اللہ کی محبت کے قابل ذکر اجزاء سے محرومی کی وجہ سے یہ افراد اکثر نفسی مسائل اور باہمی تصادم کا شکار ہو جاتے ہیں۔

وہ محبت ورواداری، اپنائیت، اور نرمی جیسی صفات سے بے بہری کی وجہ سے اپنی ساری صلاحیتوں کے باوجود ان محاذوں پر پیش قدمی سے قاصر رہتے ہیں۔

اس طرح ملت کے قیمتی ادارے یا تو ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یا ان کی کارکردگی برائے نام یا رپورٹ کارکردگی تک محدود ہو جاتی ہے اس سے دو طرفہ نقصان ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ ذہین وباصلاحیت افراد کی توانائیوں کا ضیاع ہوتا ہے۔

دوم یہ کہ سیاسی، سماجی اور معاشرتی محاذ صحتمند قوتوں کے اثرات سے محروم رہتا ہے۔ اور منفی قوتیں ان محاذوں پر کام کی وجہ سے معاشرہ کو اخلاقی طور پر تباہی کے دہانے کھڑا کر دیتی ہے۔

ضرورت ہے کہ ان محاذوں پر کام کرنے والے دینی افراد کو یہ نکتہ سمجھانے کی کوشش کی جائے کہ اللہ کی محبت میں داخل ہو کر وہ خود بھی مستحکم ہوں گے تو ریاست معاشرہ کے استحکام کا بھی ذریعہ ثابت ہوں گے، اللہ کی محبت اور دل کی سلامتی کے بغیر محض ذہانت، صلاحیت اور مادی وسائل سے اداروں کے استحکام کا کام نہیں ہوتا، اس کے لئے غیر معمولی ایمانی اور روحانی قوت کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔

دنیا میں جتنی بھی بُرائیاں موجود ہیں، وہ سب کی سب نفس امارہ کے ساتھ وابستہ ہیں یعنی وہ نفس امارہ کا نتیجہ ہیں۔ یہ بُرائیاں ظاہری ہوں یا باطنی، ان سب کا تعلق نفس امارہ سے ہے۔ ظاہری بُرائیوں میں قتل، فساد، زنا، شراب، سود اور اللہ اور بندوں کے جنون کی تلفی جیسی ساری توائیاں شامل ہیں، باطنی بُرائیوں میں حرص، ہوس، بخل، کینہ، بغض، حسد، جلن، حب جاہ، حب مال، مادی حسن پر فدائیت، دوسری کی تذلیل، عجب وخود پسندی، جذبہ شہرت، ریا، سنگ دلی، قساوت قلبی وغیرہ جیسی ساری بُرائیاں شامل ہیں۔

جب فرد وافراد پر نفس امارہ کا غلبہ ہوتا ہے اور معاشرہ میں اس طرح کی بُرائیوں کے لئے حالات بھی سازگار ہوتے ہیں تو نفس امارہ افراد کو ان بُرائیوں کے اکسانے پر مجبور کرتا ہے جس سے معاشرہ سراپا فساد زدہ ہو جاتا ہے اور شیطنت کا چلن عام ہو جاتا ہے۔

نفس امارہ کی موجودگی میں ریاست اور معاشرہ کو ہر طرح کے گناہوں اور فساد سے بچانے کی کوئی صورت موجود نہیں ہے، قانون کے نفاذ کے ذریعہ کسی حد تک طاقت کے خوف سے فساد میں تھوڑی بہت کمی آ سکتی ہے، لیکن نفس امارہ دولت اور قوت سے اپنے جذبات فساد کے مظاہرے کی بہت ساری صورتیں نکالنے میں کامیاب ہوتا جاتا ہے۔

نفس امارہ کی اس فساد زدہ اور خوفناک قوت سے بچنے کی مختلف صورتیں موجود ہیں۔

ابتدائی صورت یہ ہے کہ معاشرہ میں نفس امارہ کی پیدا کردہ خرابیوں اور فساد کا ادراک پیدا ہو اور ان خرابیوں سے بچنے کی طلب پیدا ہو۔ لیکن جب ریاست کے بیشتر ادارے نفس

امارہ کے حامل افراد کے ہاتھوں میں ہوں تو ظاہر ہے معاشرہ میں اس طرح کی طلب پیدا کرنا دشوار تر کام ہے۔

نفس امارہ کی پیدا کردہ ان خرابیوں کے ساتھ ساتھ انسانی شخصیت میں موجود نفس مطمئنہ کی قوت یا استعداد بھی موجود ہے۔ نفس مطمئنہ کی خصوصیات میں صبر، شکر، تقویٰ، اخلاص، محبت، رواداری، صدق عملی، بُردباری، رحم دلی، انسانیت نوازی، زہد، درویشی، توکل، قناعت، اور سادگی جیسی ساری صفات وخصوصیات شامل ہیں۔

جب افراد میں نفس لوامہ سے نفس مطمئنہ کی صلاحتیں پیدا ہوتی ہیں اور معاشرہ میں ایسے افراد کی تعداد میں اضافہ ہونے لگتا ہے تو معاشرہ میں وہ صفات اور خوبیاں پیدا ہونے لگتی ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا۔

لیکن بنیادی سوال یہ ہے کہ نفس کی حالت میں تغیر پیدا کر کے، اسے نفس مطمئنہ تک کیسے پہنچایا جائے، تاکہ معاشرہ وریاست کو فرد وافراد کی نفسی خرابیوں بلکہ تباہ کاریوں سے بچایا جائے، اس کا بہتر اور مؤثر جواب یہ ہے کہ افراد معاشرہ میں اللہ کی راہ محبت میں چلنے اور محبوب حقیقی سے والہانہ محبت (جو فطرت کی گہرائیوں میں موجود ہے) اس راہ پر گامزن ہونے پر آمادہ کیا جائے۔

راہ محبت میں جو افراد بھی شامل ہوتے جائیں، وہ جب ذکر وفکر کے مجاہدوں کے ذریعہ نفسی قوتوں کو آتش عشق میں جلاتے رہیں گے تو اس سے بتدریج نفس کی حالت میں بنیادی تغیر پیدا ہوتا جائے گا اور وہ نفس امارہ سے نفس لوامہ کی حالت میں آئے گا اور ذکر وفکر کے غیر معمولی مجاہدوں کے بعد ایک وقت آئے گا کہ یہ نفس مطمئنہ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگا۔ لیکن اگر فرد وافراد نفس مطمئنہ کی حالت تک نہ بھی پہنچ سکیں، نفس لوامہ کی آخری سطح تک پہنچ جائیں تو بھی فرد وافراد کے اندر سے انسانی جوہر اجاگر ہوگا اور وہ ساری صفات وخصوصیات کسی نہ کسی حد تک پیدا ہونا شروع ہو جائیں گی۔ جن کا اوپر ذکر ہوا۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ افراد کی باطنی بیماریوں اور رزائل کے ازالہ اور ان کی پاکیزہ انسانی صفات کو جلا دینے دوسرے الفاظ میں تہذیب نفس کی سب سے مؤثر وبہتر صورت یہی ہے کہ فرد وافراد راہ محبت میں استقامت سے چلتے رہیں۔ اللہ کی والہانہ محبت آہستہ آہستہ نفسی قوتوں کو آتش عشق میں جلا کر ان قوتوں کو مہذب بنانے میں کامیاب ہوگی۔

سلف صالحین میں معاشرہ اور افراد کو مہذب بنانے کا صدیوں سے یہی طریقہ مروج رہا ہے۔ اور اس سے اب تک ان گنت افراد کی اصلاح ہوتی رہی ہے اس طرح معاشرہ نفس امارہ کے فساد سے بڑی حد تک بچتا رہا ہے۔

موجودہ دور میں چونکہ ہماری جدید تعلیم یافتہ آبادی میں تہذیب نفس کے اس طریقہ کا ادراک سلب ہوگیا ہے، اس لئے ریاست ومعاشرہ کو افراد کے فساد سے بچانے اور معاشرہ میں پاکیزہ صفات کے حامل افراد تیار کرنے کی راہیں مسدود ہوگئی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی راہ محبت میں وہ ساری صفات وخصوصیات موجود ہیں جو توحید کا حاصل ہیں اور انسانیت کا سرمایہ ہیں ہر باطنی بیماری کا الگ الگ علاج ہو اور ہر نیکی پر عمل کرنے کے لئے الگ الگ مجاہدہ ہو، یہ عمل ایسا ہے جو بہت زیادہ دشوار تر ہے، پھر یہ ہے کہ معاشرہ میں اس طرح کے مجاہدوں کے ماہرین بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔

حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی جو برصغیر ہند کے بڑے بڑے علماء کے مرشد وروحانی استاد ہیں، راہ سلوک سالکوں کے لئے ان کا روزانہ کا تجویز کردہ اسم ذات کا ذکر ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے جب کہ کم سے کم استعداد کے حامل سالک کے لئے روزانہ چوبیس ہزار کا اسم ذات کا ذکر ہے، ذکر کا یہ مجاہدہ ایسا ہے جو فرد وافراد کے سارے رزائل کی اصلاح کے لئے کافی ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ افراد مستقل مزاجی سے اس پر مداومت اختیار کریں۔

اس ذکر پر مداومت کے نتیجہ میں ہی افراد معاشرہ کی نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ کی صلاحیتیں ابھرتی جائیں گی۔

(۸۸) اخلاص، للھیت، بے نفسی اور محض اللہ کے لئے کام کرنے کی نیت کو درست اور مستحکم کرنا، یہ سب سے اہم کام ہے اور دین کے مقاصد میں شامل ہے۔ اس کے بغیر دین کے لئے ہونے والے سارے کام ایسے ہیں، جو فائدہ کے بجائے الٹا وبال بن سکتے ہیں، اس لئے کہ اللہ کے ہاں سارے کاموں کی قبولیت کا شرف اخلاص نیت کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس اعتبار سے ہم اگر اپنا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ہمارا نفس اور نفسی قوتیں اتنی طاقتور ہیں کہ اول تو وہ نیک کام کرنے نہیں دیتی، اگر کرتے بھی ہیں تو اس میں ریا، دکھاوا، جذبہ شہرت یا دنیاوی مفادات کی گہری آمیزش موجود ہوتی ہے۔

ہمارے سارے کاموں میں اخلاص نیت پیدا ہوجائے اور اخلاص نیت کا ملکہ راسخ ہوجائے، یہ ایسا کام ہے، جو نفسی قوتیں کے ساتھ سخت معرکہ آرائی اور مقابلہ کے بغیر نہیں ہو سکتا، یہ مقابلہ بھی ایک دوسال کا مقابلہ نہیں، بلکہ عرصہ تک نفس سے معرکہ آرائی کرکے، اسے محض اللہ کے لئے جینے اور اللہ کے لئے مرنے کے سلیقہ سے آشنا کرنا پڑتا ہے اور اس تقاضے کو مستحکم کرنا پڑتا ہے، نفس جو مادہ کی پیداوار ہے، وہ ہر کام میں مادی مفادات اور مادی مقاصد کو سامنے لاکر، ان کی بجا آوری کی راہ پر گامزن کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح فرد وافراد کے بیشتر اعمال (جو بظاہر نیکی پر مبنی ہوتے ہیں) وہ بباطن نفس پرستی کا ذریعہ ہوتے ہیں، اور ان کاموں میں اللہ کی رضا وخوشنودگی مقصود نہیں ہوتی، بلکہ لوگوں میں نام آوری اور شہرت مقصود ہوتی ہے، اخلاص نیت، للھیت اور بے نفسی پیدا کرنے کی سب سے مؤثر صورت اللہ کی محبت میں داخل ہوکر، ذکر وفکر سے کام لینے اور اللہ کے جلالی وجمالی صفات کے عکس کے ذریعہ نفسی قوتوں کی تہذیب اور ان کو مضمحل کرنے سے وابستہ ہے، اس کے بغیر نفس مہذب ہوکر، محض اللہ کے لئے اعمال کرنے اور اللہ کے لئے جینے اور مرنے کی آرزوں سے سرشار ہو سکے، غیر معمولی طور پر دشوار ہے۔

جب افراد، خودنمائی اور خودغرضی جیسے جذبات سے عبارت ہوجاتے ہیں تو ایسے افراد

پر مشتمل معاشرہ کی ساری زندگی اسی طرح کے مظاہر کا نمونہ بن جاتی ہے۔ چنانچہ اس وقت ہماری معاشرتی، سماجی، سیاسی اور ساری اجتماعی زندگی جذبہ شہرت، پبلسٹی، خود نمائی، ریا، دوسروں سے داد حاصل کرنے کی کاوشوں، ان کی نظروں میں معزز بننے کی خواہشوں اور اس کے مظاہر سے عبارت بن گئی ہے، شادیوں کی تقریبات ہوں یا سیاسی، سماجی، علمی وادبی اور مذہبی نوعیت کے اجتماعات، ان تقریبات کے خصوصی اہتمام کے پس منظر میں اصل جذبات وہی ہوتے ہیں، جن کا اظہار کیا گیا، دنیا واہل دنیا سے بے نیاز ہوکر، محض اللہ کی رضامندی اور للھیت کے جذبات کا عکس ان تقریبات میں شامل ہو، اس کا غیر معمولی فقدان ہوگیا ہے۔

جب ہماری قوم کی اجتماعی زندگی سے اللہ کی رضا کا مقصد سلب ہوگیا ہو، خودغرضی اور خودنمائی جیسے جذبات غالب آگئے ہوں تو اس طرح کی صورتحال میں اعمال سے برکات ظاہر ہوں تو کیسے ہوں، اس طرح کے افراد معاشرہ اللہ کے جتنے بھی عتاب کا شکار ہوں، کم ہے۔ اعمال میں اخلاص نیت کے فساد کی وجہ سے آخرت میں ان اعمال کی وجہ سے ہمارے ساتھ جو معاملہ ہوگا، وہ ایسا ہے جو ہماری دائمی زندگی کو تاریک کرنے کا موجب ہوگا۔

اخلاص نیت اور للھیت کی اتنی زیادہ اہمیت کے باوجود دکھ واذیت کی بات یہ ہے کہ تقریبا ہمارے سارے طبقات کی حالت یہ ہے کہ وہ اخلاص نیت پیدا کرنے جیسے عظیم کام کے لئے وقت نکالنے، اس کے لئے فکرمندی کا مظاہرہ کرنے اور مجاہدوں سے کام لینے کے لئے تیار نہیں، یہی نہیں، بلکہ بدقسمتی سے افراد معاشرہ سے سرے سے اس کام کی اہمیت کا ادراک ہی سلب ہوگیا ہے۔ جو ہمارے معاشرہ کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ اور معاشرہ میں پیدا ہونے والی ساری خرابیوں کا بڑا سبب بھی یہی ہے۔

اخلاص نیت کے کام کے سلسلہ میں جب اللہ کے رسول کے فرمان دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سب سے بڑا کام تو یہی ہے، جو کرنے کا ہے۔

اس کام کی اہمیت کے پیش نظر کچھ احادیث رسول پیش کی جاتی ہیں، شاید دل کی

آنکھیں بیدار ہوں اور ہم اس مقصد کے لئے وقت دینے کے لئے تیار ہوں۔

سرکار دوعالم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

لایستکمل العبد الایمان حتی تکون قلة الشیء احب الیه من کثرته وحتی یکون ان لایعرف احب الیه من ان تعرف. (مسند الفردوس۔ علی ابن ابی طلحہ رضی اللہ عنہ)

بندہ کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا، جب تک کہ اس کے لئے کم چیز زیادہ سے محبوب نہ ہو (یعنی قناعت پسندی نہ ہو) اور جب تک کہ عدم شہرت، شہرت سے زیادہ محبوب نہ ہو۔

ایک حدیث میں سرکار دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ان اللہ لاینظر الیٰ صورکم واموالکم وانما ینظر الیٰ قلوبکم واعمالکم. (مسلم۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ)

اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا، بلکہ وہ تمہارے دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے، دلوں کو اس لئے دیکھتا ہے کہ وہ نیت کا محل ہیں۔)

ایک روایت میں ہے:

بندہ اچھے عمل کرتا ہے، فرشتے اس کے سربمہر اعمال نامے لے کر اوپر جاتے ہیں، اور انہیں اپنے رب کے سامنے پیش کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، یہ صحیفہ دور پھینکو، اس نے اپنے ان اعمال سے میری خوشنودی کا ارادہ نہیں کیا تھا، پھر اللہ ملائکہ سے فرماتا ہے، فلاں شخص کے لئے ایسا ایسا لکھو، فلاں کے لئے یہ یہ لکھو، فرشتے عرض کریں گے، اے پروردگار، اس نے یہ عمل نہیں کئے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا، اس نے ان اعمال کی نیت کی تھی۔

ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ آدمی چار طرح کے ہوتے ہیں، ایک وہ شخص ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے علم اور مال عطا کیا ہو اور وہ شخص اپنے علم کی روشنی میں اس مال کو صحیح استعمال کرتا ہو اور دوسرا وہ ہے، جو یہ کہے کہ اگر مجھے بھی اللہ تعالیٰ علوم اور

مال عطا کرتا تو میں بھی اس کو اس طرح استعمال کرتا، جیسا اس نے کیا ہے، یہ دونوں شخص اجر میں برابر ہیں، ایک شخص وہ ہے، جسے اللہ نے مال عطا کیا ہو، علم نہ دیا ہو اور وہ اپنے جہل کے باعث اپنے مال کا غلط استعمال کرتا ہو، اور دوسرا شخص یہ کہتا ہو کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے بھی مال عطا کرتا تو میں بھی ایسا ہی کرتا، جیسا یہ شخص کرتا ہے تو یہ دونوں شخص گناہ میں برابر ہیں۔ (ابن ماجہ۔ ابو کبشہ الانباری رضی اللہ عنہ)

دیکھئے، محض نیت کی بناء پر کیسے دو شخص دوسرے دو شخصوں کے نیکیوں اور خرابیوں میں شریک قرار دیئے گئے، ایسی ہی ایک روایت حضرت انس ابن مالک سے منقول ہے کہ جب سرکار دو عالم ﷺ تبوک کی لڑائی میں تشریف لے گئے تو فرمایا کہ مدینے میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ ہم جو سفر کر رہے ہیں، اور کافروں کی آتش انتقام کو بھڑکانے والی جو زمینیں ہم اپنے پاؤں سے روند رہے ہیں، یا جو کچھ ہم خرچ کرتے ہیں یا جو فاقے ہم برداشت کرتے ہیں، وہ لوگ ان تمام چیزوں میں ہمارے ساتھ شریک ہیں، حالانکہ وہ مدینے میں ہیں، لوگوں نے عرض کیا، یارسول اللہ! یہ کیسے ممکن ہے، جب کہ وہ ہمارے ساتھ نہیں ہیں، فرمایا، وہ لوگ عذر کے باعث وہاں رہ گئے، جب کہ وہ اپنی حسن نیت کی وجہ سے ہمارے اعمال میں شریک ہیں۔ (بخاری وابوداؤد)

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ جو شخص کسی چیز کے لئے ہجرت کرے تو وہ اسی کا ہے، چنانچہ ایک شخص نے ہماری ایک خاتون سے نکاح کرنے کے لئے ہجرت کی تو اس شخص کو ام قیس کا مہاجر کہا جانے لگا۔ (طبرانی)

ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص اللہ کی راہ میں مارا گیا اور قتیل حمار کے نام سے مشہور ہوا، کیونکہ وہ شخص اپنے حریف سے اس لئے لڑا تھا کہ اس سے اس کا گدھا چھین لے، چنانچہ مارا گیا، اور اسی کی طرف منسوب ہوا، حضرت عبادہ کی روایت میں ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا، جس شخص نے محض حصول مال کے لئے جہاد کیا، اسے اس کی نیت کے مطابق ہی

حصہ ملے گا۔ (عبادۃ ابن الصامت رضی اللہ عنہ)

حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک شخص نے کہا کہ وہ لڑائی میں میری مدد کے لئے چلے، اس شخص نے کہا، اگر تم میری اجرت مقرر کر دو تو میں تمہارے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہوں، چنانچہ میں نے اجرت مقرر کر دی (اور وہ میری مدد کے لئے غزوہ میں شریک ہوا) میں نے اس کا تذکرہ سرکار دو عالم ﷺ کی جناب میں کیا، آپ نے ارشاد فرمایا: اس شخص کو دنیا و آخرت میں سے اسی قدر ملا ہے، جس قدر تم نے اس کے لئے مقرر کر دیا تھا۔

ایک اسرائیلی روایت میں ہے کہ ایک شخص قحط کے زمانے میں ریت کے ایک ٹیلے کے پاس سے گزرا، اس نے دل میں سوچا، اگر یہ ریت، غلہ بن جائے تو میں لوگوں میں تقسیم کروں، اللہ تعالیٰ نے اس زمانے کے پیغمبر پر وحی نازل فرمائی کہ اس شخص سے کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ نے تیرا صدقہ قبول کر لیا ہے، اور اس نے تیری حسن نیت کا شکریہ ادا کیا ہے، اور تجھے اسی غلے کے مطابق اجر و ثواب عطا کیا ہے، جو تو نے صدقہ کرنے کا ارادہ کیا تھا۔

ایک روایت میں وارد ہوا ہے:

من هم بحسنة ولم يعملها كتبت له حسنة. (بخاری)

جس شخص نے کسی نیکی کا ارادہ کیا، اس کے لئے وہ نیکی لکھ دی گئی۔

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت میں ہے کہ جس شخص کی نیت صرف دنیا ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ فقر و افلاس اس کی دونوں آنکھوں کے درمیاں رکھ دیتا ہے، اور وہ دنیا میں زیادہ راغب ہو کر، دنیا سے جدا ہوتا ہے اور جس شخص کی نیت آخرت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اس کے دل میں استغناء (یعنی دنیا سے بے نیازی) پیدا کر دیتا ہے، اور بے نیازی کا انتظام اس کا سامان اس کے لئے کر دیتا ہے اور وہ دنیا سے زاہد ہو کر رخصت ہوتا ہے۔ (ابن ماجہ۔ زید ابن ثابت)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت میں ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ایک ایسے لشکر کا ذکر کیا، جو جنگل میں زیر زمین دھنستا ہوگا۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا، ان میں وہ شخص بھی ہوگا، جو زبردستی یا اجرت دے کر لشکر میں شامل کیا گیا تھا؟ آپ نے فرمایا، ان کا حشر ان کی نیتوں کے مطابق ہوگا۔ (مسلم، ابوداؤد)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے، سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

انما یقتتل المقتتلون علی النیات. (ابن ابی الدنیا)

(آپس میں لڑنے والے اپنی اپنی نیتوں پر ایک دوسرے کو مارتے ہیں)۔

ایک روایت میں ہے کہ جب دو لشکر برسرپیکار ہوتے ہیں تو فرشتے اترتے ہیں اور مخلوق کے لئے ان کے درجات کے مطابق لکھتے ہیں کہ فلاں شخص دنیا کے لئے لڑتا ہے، اور فلاں غیرت وحمیت کے لئے، فلاں تعصب کے لئے، خبردار! کسی شخص کو شہید مت کہو، جو شخص اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے لڑتا ہے، صرف وہ شخص شہید ہے۔ (ابن المبارک۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ مرسلا، بخاری ومسلم۔ ابوموسیٰ)

(۸۹) فرد، جس تنظیم، ادارے اور تحریک سے وابستہ ہے، اگر اس میں خیر کے کافی اجزا موجود ہوں تو اسے اس تنظیم سے ہر طرح کے حالات میں وابستگی کو قائم رکھنا ضروری ہے، بعض معاملات میں اختلافات کے باوجود اداروں سے وابستگی کا سلیقہ آنا چاہئے، تاکہ دینی اداروں کے استحکام کی صورت پیدا ہو سکے۔ نفس وشیطان تو یہی چاہتا ہے کہ فرد کو اپنی رائے پر ڈٹ جانا چاہے، اگر جماعتیں اور ادارے اس رائے کو اہمیت نہیں دیتے تو ایسے اداروں وتنظیموں کی ضرورت باقی نہیں، یاد رکھنا چاہے کہ ادارے ملت کا سرمایہ ہیں، ان اداروں یا تنظیموں میں ٹوٹ پھوٹ یا انتشار پیدا کرنا (حقیقی جواز کے بغیر) ملی اعتبار سے بڑا جرم ہے، فرد کو ایسی حرکتوں سے ہر ممکن حد تک بچنے کی کوشش کرنا چاہئے، جس سے دینی اداروں اور تنظیموں کی کمزوری کی صورت پیدا ہو۔

ہاں جب اداروں میں مفادات کا غلبہ ہو یا جو ادارے ملت سے زیادہ کچھ افراد کے مالی استحکام کا ذریعہ بنتے ہوئے نظر آئیں، ان سے جدائی کا جواز موجود ہے۔ اس طرح کی ایک حدیث شریف بھی موجود ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جب خودرائی کا دور آجائے (یعنی ہر شخص اپنی رائے سے کسی قیمت پر دستبردار ہونے کے لئے تیار نہ ہو تو) اس صورت میں تم دوسروں کی فکر چھوڑ کر اپنی اصلاح کی فکر میں مصروف ہو جاؤ۔

(۹۰) یہ نکتہ بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ موجودہ دور میں طاغوت کی قوتیں عالمی سطح پر منظّم ہیں اور غیر معمولی طور پر طاقتور ہیں، ان کا اصل ہدف اسلام کے بنیادی عقائد اور اسلامی تہذیب ہے، وہ ہماری نسلوں کو مادہ پرست انسان بنانے کی کاوشوں میں مصروف ہیں اور اس مقصد کے لئے اپنی توانائیاں اور وسائل خرچ کر رہے ہیں، عالمی طاغوت کا مقابلہ اداروں، تنظیموں اور اجتماعی جدوجہد کی صورت میں ہی بہتر طور پر ہو سکتا ہے، اس لئے جو ادارے اور تنظیمیں یہ کام کر رہی ہیں، وہ ہر اعتبار سے قابل قدر ہیں۔ ان کا ساتھ دینا ضروری ہے۔ ہاں اگر ان سے وابستگی سے اپنی ذاتی اصلاح کا کام متاثر ہوتا ہو تو دوسری بات ہے۔

(۹۱) اپنا دعوتی کام اس طرح کرنا، جس سے دوسرے دعوتی کاموں کی تردید وتنقیص کا پہلو غالب ہو، یہ امر ظاہر کرتا ہے کہ فرد کی شخصیت میں نفسیانیت کا پہلو غالب ہے، اگر اس طرح کی صورتحال ہو تو فرد کو چاہئے کہ وہ دوسروں کی فکر چھوڑ کر اپنی اصلاح کے کام کو اہمیت دے اور اپنے بچاؤ کی فکر کرے۔

(۹۲) انسانوں کا درد اور فکر ہونا بھی ضروری ہے۔ انسانیت کا درد اس لئے بھی ناگزیر ہے کہ آج انسان سارے علوم سے خدا کے عقیدہ کو نکالنے، بلکہ اسے مسترد کرنے کی وجہ سے آگ کے دھکتے ہوئے بہت بڑے الاؤ کے کنارے پر کھڑا ہے، جہاں آگ کی تپش سے اس کی زندگی عذاب سے دوچار ہوگئی ہے سینکڑوں نئے نئے مسائل اور مشکلات نے اس کا اس طرح احاطہ کر لیا ہے کہ پوری انسانی تاریخ اس طرح کے مصائب سے کبھی دوچار نہیں ہوئی۔

انسانیت تک اللہ کے دین کی اتمام حجت کا کام بھی مسلم امت کے حوالے ہے، اس اعتبار سے بھی اپنے کردار کی فکر ہونی چاہئے، اس سلسلہ میں میڈیا کے جدید ذرائع سے کام لے کر دعوتی کام کیا جاسکتا ہے اور باصلاحیت افراد کو اس طرف خصوصی توجہ دینی چاہئے، لیکن انسانیت تک دعوت دین کی سب سے مؤثر صورت تو یہی ہے کہ اللہ کی محبت میں مستحکم افراد کا معاشرہ قائم ہو، وہ چاہے چھوٹی سطح کا معاشرہ ہی کیوں نہ ہو۔

اس معاشرہ کی خصوصیات یہ ہوں کہ اللہ کے لئے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہوں، اپنی دولت میں کمزور اپنا افراد کا خصوصی حصہ رکھتا ہوں۔ دوسروں کے درد وغم کو اپنا درد سمجھتے ہوں اور ان کے لئے ایثار وقربانی کا مظاہرہ کرتے ہوں، ان کے باہمی تعلقات مثالی نوعیت کے ہوں، ان کی سیاست، معیشت ومعاشرت مکمل اسلامی تعلیمات سے ہمہ آہنگ ہو، اس معاشرہ میں معیشت کی دوڑ میں ایک دوسرے سے حریصانہ طور پر آگے بڑھنے کی روش کا خاتمہ ہو، افراد، اعلیٰ انسانی صفات سے بہرہ ور ہوں، اس طرح کا معاشرہ ہی، جدید پریشان حال انسانیت کو اسلام کی انسانیت نواز تعلیمات سے متاثر کرکے اپنی طرف راغب کرسکتا ہے۔

اور اس طرح ان کے دلوں میں اسلام کی آغوش میں پناہ لینے کی طلب پیدا ہوسکتی ہے۔ اس طرح کا معاشرہ، معاشرہ کی سطح پر افراد کو تبدیل کرکے، اللہ کی محبت کی بنیاد پر ان کی داخلی زندگی میں فیصلہ کن تبدیلی پیدا کرنے کے نتیجہ میں ہی پیدا ہوسکتا ہے۔ اگر جدید تعلیم یافتہ طبقات اللہ کی محبت کے کام کی طرف متوجہ ہوں تو اس طرح کے معاشرہ کی تیاری کا کام بہتر طور پر ہوسکتا ہے۔

(۹۳) اس امر کا فہم ہونا بھی ضروری ہے کہ جو فرد، اللہ کے لئے اپنی قیمتی چیز سے دستبردار ہوتا ہے تو اللہ اسے اس سے بہتر قیمتی تر چیز عطا فرماتا ہے۔ اللہ کو فرد کی یہ ادا کہ وہ اللہ کے لئے بے پناہ ایثار وقربانی کا مظاہرہ کرتا ہے، سب سے زیادہ پسند ہے، اس کی وجہ سے وہ نوازا جاتا ہے۔ مثلاً ایک فرد معاشی خوشحالی کی زندگی سے دستبردار ہوکر اللہ کی محبت کے لئے

نفسی قوتوں کی پامالی کی راہ اختیار کرتا ہے۔ یا ایک شخص اپنی ذاتی اصلاح کے ساتھ ساتھ دعوتی کام کو بھی ہدف بناتا ہے، اپنی صلاحیتیں اس کام میں لگا دیتا ہے اور وہ اپنی معاشی فکر اور خوشحال مادی زندگی سے بے نیاز ہوکر، یہ راہ اختیار کرتا ہے تو اسے ایک ایسی نئی زندگی عطا فرمائی جاتی ہے، جو خوشیوں اور لذتوں سے سرشار زندگی ہوتی ہے، اگرچہ درمیاں میں اسے صبر آزما مراحل سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے، لیکن یہ صبر آزما مراحل اور مصائب اس لئے ہوتے ہیں، تاکہ وہ مستحکم سے مستحکم تر ہوسکے اور اللہ پر یقین کے سلسلہ میں وہ کمال درجہ تک پہنچ سکے۔

اللہ کے لئے ایثار وقربانی کے مظاہرہ سے گھبرانے کا بنیادی سبب یہ ہے کہ نفس کی اکساہٹ کی وجہ سے فرد یہ سمجھنے لگتا ہے کہ ایسا کرنے سے وہ معاشرہ سے کٹ جائے گا اور وہ زمانہ کا ساتھ نہ دینے کی وجہ سے مصائب کا شکار ہوگا، حالانکہ اگر وہ اللہ کے نصرت کے اس قانون کو پیش نظر رکھتا، جس کا قرآن کی بہت ساری آیات میں بیان ہوا ہے تو وہ اس احساس کا شکار نہ ہوتا۔

ومن یتق اللہ یجعل لہ من امرہ یسریٰ.

(جو شخص تقویٰ اختیار کرتا ہے اللہ اس کے کاموں میں آسانی پیدا کردیتا ہے۔)

ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا ویرزقہ من حیث لایحتسب.

(جو تقویٰ اختیار کرتا ہے اللہ اس کے لئے مشکلات سے نکلنے کے راستے پیدا کردیتا ہے اور اس کی روزی کا انتظام ایسی جگہ سے کرتا ہے کہ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتا)۔

(۹۴) راہ محبت وراہ سلوک ایسی راہ ہے، جس میں قدم قدم پر صبر اور ہمت وحوصلہ کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، روزانہ زندہ ہوکر موت کے مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ ایک تو کیفیات کا ادل بدل ہوتا ہے، جس سے طالب کو سامنا کرنا پڑتا ہے، دوم، دل کے فتویٰ سے واسطہ پڑتا ہے، دل کا مفتی بتدریج طاقتور ہوتا جاتا ہے، اس کی فتویٰ کے تحت زندگی کے رنگ ڈھنگ کو بدل کر شریعت سے ہمہ آہنگ کرنا پڑتا ہے۔ سوم، عرصہ تک نفسی قوتوں کی طوفانی

لہروں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے، بعض اوقات طالب، خواہشات کے طوفانوں کا مقابلہ کرتے کرتے تھک جاتا ہے۔

چہارم، دنیا کے حوالے سے کم سے کم حصہ پر قناعت کرنا پڑتی ہے، اس لئے کہ دنیاوی الجھنیں طالب کے دل وذہن کی یکسوئی کو بُری طرح متاثر کرنے کا موجب ثابت ہوتی ہیں۔

پنجم، فرد کو قدم قدم پر مادہ پرست ماحول سے واسطہ پڑتا ہے، جہاں مفادات کی جنگ جاری رہتی ہے، ٹکرا ہوتا ہے، ہر کام میں جھوٹ، مکر وفریب، وعدہ خلافی، حب جاہ وحب مال کے جذبات کارفرما ہوتے ہیں، مفادات کی یہ جنگ طالب کو اذیت سے دوچار کردیتی ہے۔

ششم، اس کا دل محبوب کے جذباتِ محبت سے بے قابو ہونے لگتا ہے، وقت کی قلت اور معاشی مصروفیات کی وجہ سے ذکر وفکر کے لئے مطلوبہ وقت نہ دینے کی وجہ سے دل کی تسکین نہیں ہوتی، دل کو روزانہ کئی بار ذکر وفکر کی خوراک دینا پڑتی ہے، ایسا نہ ہونے کی وجہ سے دل کی طلب اور اس کی بے قراری بڑھنے لگتی ہے۔

ہفتم، اگرچہ طالب کے ساتھ محبوب کی نصرت شامل حال رہتی ہے، وہ گرنے لگتا ہے تو اسے تھام لیا جاتا ہے، اس کی روزی اور وقت میں برکت ہوتی ہے، مشکل سے مشکلات حالات میں ذکر ومراقبہ کے لئے وقت نکلنے کی صورتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن طالب، حالت سکر کے غلبہ کی وجہ سے اپنے آپ کو قابل رحم سمجھنے لگتا ہے۔ ہر وقت کیفیات کا ادل بدل، وقت اور زمانہ کی چلن سے تصادم، لوگوں سے زیادہ میل وجول اور زیادہ گفتگو سے بیزاری جیسے حالات طالب کے دکھ وغم میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن طالب کو دوران ذکر ومراقبہ یا دوران محبت، حلاوت کی جو بے پناہ کیفیات نصیب ہوتی ہیں، وہ ان سارے مشکل حالات کے باوجود اسے اس راہ پر چلنے پر ابھارتی رہتی ہیں۔

طالب کی مذکورہ جن مشکلات کا ذکر کیا گیا، یہ مشکلات ایسی ہیں، جو روزمرہ زندگی کا حصہ ہوتی ہیں۔ جب اس پر قبض وبے چینی کی حالت طاری ہوتی ہے تو اس کے لئے ایک ایک

لمحہ قیامت خیز ہوتا ہے۔ کبھی تو اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اسے تنکہ لگتا ہے تو وہ اپنے اوپر پہاڑ گرتے ہوئے محسوس کرتا ہے، کبھی پہاڑ جیسی مشکلات کے باوجود وہ یوں محسوس کرتا ہے، گویا اسے تنکا لگا ہے۔

اللہ کی راہ میں ایک بار جان کا نذرانہ دے کر شہید ہونا آسان کام ہے، لیکن اللہ کی جلالی صفات کے زیر اثر روزانہ زندہ ہوکر، روزانہ موت سے دوچار ہونا اور نفسی قوتوں کو روزانہ محبوب کے جلالی صفات کے تیروں سے چھلنی کرنا، بہت دشوار تر اور صبر آزما کام ہے۔

ان مشکل حالات میں صبر اور مستقل صبر کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ اور صبر کے سلسلہ میں قرآن کی آیتوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ چند آیتیں پیش کی جاتی ہیں۔

یاایھاالذی آمنو استعینوا باالصبر والصلوٰۃ ان اللہ مع الصابرین. (البقرہ ۱۵۲)

(اے ایمان والو، صبر اور نماز سے مدد لیا کرو بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے)۔

یاایھاالذین آمنوالصبرو وصابرو ورابطوا. (آل عمران ۲۰۰)

(اے ایمان والو، خود صبر کرو اور مقابلہ میں صبر کرو اور مقابلہ کے لئے مستعد رہو)۔

اس آیت کی تفسیر میں مولانا تھانویؒ لکھتے ہیں:

رابطہ کی تفسیر مرابطہ ثغر سے ظاہر ہے۔ اور حدیث میں اسباغ وضو وانتظار صلوٰۃ وغیرہ کو رباط فرمایا ہے، جو مرابطہ نفس ہے، پس مذکورہ آیت وحدیث سے جہاد نفس پر جہاد کے اطلاق کی اصل نکلی)۔

وصبر وما صبرک الیٰ باالله. (النحل آیت ۱۲۷)

(اور صبر کرو اور تمہارا صبر بھی اللہ کی مدد سے ہی ہے)۔

وصبر علیٰ ما اصابک. (لقمان ۱۷)

(اور جو مصیبت تجھ پر واقع ہو، اس پر صبر کرنا)۔

انما یوفی الصابرین اجرھم بغیر حساب.

(بلاشبہ صبر کرنے والوں کو ان کے اجر سے بے حساب نوازا جائے گا)۔

(۹۵) ایک اسلامی تنظیم سے وابستہ دانشور نے اپنی یہ مشکل بیان کی کہ میں جب کوئی مضمون لکھتا ہوں یا تقریر کی تیاری کرتا ہوں تو دل کہتا ہے کہ یہ سب ریا اور دکھاوا ہے، یہ چھوڑ دو، اس دانشور کا کہنا تھا کہ میں سخت مشکل اور پریشانی میں ہوں، آپ بتائیں کہ میں کیا کروں۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے کثرت ذکر سے پہلے دین کے لئے ہونے والے سارے کاموں میں اخلاص وللّٰھیت کی صورت پیدا ہو سکے، لگ بھگ ناممکنات میں سے ہے، بلکہ بالخصوص اہل علم واہل دانش اور معاشرے میں مقام کے حامل افراد کو ذکر کے ساتھ صحبت اہل اللہ کی بھی سخت ضرورت ہے، تاکہ شخصیت میں موجود علمی زعم اور معاشرے میں موجود اپنی حیثیت کے طلسم کے ٹوٹنے کے صورت پیدا ہو سکے۔

اس طرح کے افراد کو قرآن کی درج ذیل آیتیں پیش نظر رکھنی چاہئے۔

''اے ایمان والو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا مال اور تمہاری اولاد تمہیں اللہ کے ذکر سے غافل کردے، اگر ایسا ہوا تو تم خسارے میں مبتلا ہوجاؤ گے۔

''اور اللہ کا کثرت ذکر کرو، تاکہ تم فلاح حاصل کرسکو۔''

راہ سلوک میں چلنے والے ہر طالب کو اس بات کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ نفس اور نفسی قوتیں اسے روزمرہ زندگی کے اعمال میں خودنمائی، حسد، تکبر اور حب دنیا جیسے جذبات میں مبتلا کرنے کا موجب بنتی رہتی ہیں۔

ذکر کا نور طالب کو روزانہ نفسی قوتوں سے معرکہ آرائی کی حالت میں رکھکر طویل عرصہ کے بعد کہیں جاکر نفس مطمئنہ کے مقام پر فائز کرنے کا موجب بنتا ہے۔ راہ محبت وراہ سلوک کا اس طرح کا طالب سمجھتا ہے کہ جب میرے اپنے نفس کی حالت یہ ہے کہ وہ روزانہ دسیوں بار

شرک خفی میں مبتلا کرنے کے لئے کوشاں ہوتا ہے تو اس سلسلہ میں راہ محبت سے باہر کے افراد کی جو حالت ہوسکتی ہے، وہ تو مزید قابل رحم حالت ہوگی، وہ دل کی گہرائیوں سے تمنا کرتا ہے کہ کاش کہ اسلام کا کام کرنے والے افراد نفس کے مکر وفریب کی نزاکتوں اور گہرائیوں کو سمجھکر نفس کے داخلی بتوں کو توڑ کر اخلاص وللّٰھیت کی راہ اختیار کریں، تاکہ ان کی دینی جدوجہد میں حقیقی لِلّٰھیت کے ساتھ اللہ کی حقیقی نصرت کی صورت پیدا ہوسکے۔

(۹۶) ہمارے اس دور میں سب سے زیادہ جس بت کی پرستش ہورہی ہے، وہ مال کی محبت کا بت ہے، ساری توانائیاں اور صلاحیتیں اس بت کی نذر ہورہی ہیں، مالدار سے مالدارتر بننے کی ایک دوڑ ہے، جس میں لگ بھگ ہر ذہین وباصلاحیت فرد شریک ہے، ہمارا گھر ولی ماحول، تعلیمی ماحول اور بازار کا ماحول سب سے زیادہ اسی بت کی پرستش کا مزاج پیدا کررہا ہے، جس کی وجہ سے سنگ دلی، بے رحمی اور قساوت قلبی عام ہورہی ہے، اخلاقی قدریں تباہ ہورہی ہیں۔ سکون قلبی غارت ہورہا ہے، ڈپریشن بڑھتی جارہی ہے، اور حسد وجلن کی فضا پیدا ہوتی جارہی ہے۔ عزیز واقربا اور دوست واحباب میں فاصلے بڑھ رہے ہیں۔ معاشرہ میں غریب افراد کی پرسانِ حالی کی روش تیزی سے ختم ہورہی ہے۔ مالدار افراد کے گھروں میں نئے نئے سامان کے ڈھیر لگ رہے ہیں، جب کہ ملک کی اسی فیصد آبادی روٹی کی محتاج ہے اور علاج کے اخراجات سے قاصر ہے۔

یہ ساری خرابیاں ایسی ہیں، جو حب مال کے بت کی پرستش کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس بت کی پرستش کے خلاف جہاد وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔

اس جہاد کی پہلی صورت یہ ہے کہ ہم خود اس بت کے سامنے سجدہ ریز ہونے سے انکار کریں اور ضرورت سے زائد مال اور غیرضروری سامان سے بے التفاتی کا مظاہرہ کریں۔ سادہ زندگی گزارنے اور سادگی سے رہنے کا سلیقہ سیکھیں اور اس سلسلہ میں معاشرہ کے دباؤ کے سامنے جھکنے سے انکار کردیں۔ لیکن ایسا کرنے کے لئے طاقتور ایمان کی ضرورت ہے، جو صحبت

اور ذکر کے مسلسل اہتمام سے ہی پیدا ہوگا۔

حب مال کی ایک بڑی ''خصوصیت'' یہ ہے کہ فرد پر دولت کمانے کا جنون سوار ہوجاتا ہے۔ اور مال کی کشش فرد کو کسی دوسرے کام کا رہنے نہیں دیتی اور ہر ایسا کام جس سے مالی مفاد وابستہ نہ ہو، اس سے دلچسپی باقی نہیں رہتی۔

آج دنیا کا سارا نظام اسی بت پرستی کی بنیاد پر تشکیل دیا گیا ہے، اور اس کی ڈور عالمی سرمایہ دار کے ہاتھ میں ہے۔ دکھ واذیت کی بات یہ ہے کہ دیندار سے دیندار باصلاحیت افراد جن میں ڈاکٹر، وکیل، آفیسر، ٹیکنیکل ماہر، سیاستدان وغیرہ سب شامل ہیں۔ وہ اس بت کی پرستش کی بیماری میں مبتلا ہیں اور کروڑ پتی اور ارب پتی بننے کا ایک خبط ہے، جس میں ساری صلاحیتیں اور توانائیاں ضایع ہورہی ہیں۔

اگر اس دولت سے فرد وافراد کی زندگی میں صحتمند اثرات مرتب ہوتے تو پھر تو ایک اعتبار سے ان توانائیاں کے استعمال کی کسی حد تک گنجائش نکل سکتی تھی، مثلا دولت کا فروغ اسلام کے مقاصد کے لئے استعمال ہو۔ اور وہ خدمت خلق کے کام ہو، لیکن حب دنیا کے پس پردہ یہ مقاصد نہ ہونے کے برابر ہیں۔

اگر مال کے لئے ہونے والی اس جدوجہد سے مالدار کی کھانے پینے، پہننے، اور رہنے سہنے کی ضروریات میں غیر معمولی اضافہ ہوتا تو پھر بھی ایک بات تھی، یعنی اس دولت سے مالدار کی کھانے کی صلاحیت ایک روٹی کی بجائے سو روٹیاں ہوجائیں۔ کپڑوں کے ایک جوڑے کے بجائے سو جوڑے اس کی ضرورت ہوجائیں، ایک بستر کے بجائے سو بستر ہوجائیں ایک کمرے کی بجائے سو کمرے میں رہنے کی صلاحیت پیدا ہوجائے۔

جب ان میں سے کوئی چیز نہیں اور عام افراد اور ان کے درمیاں ضرورت کی ان بنیادی چیزوں میں کوئی فرق واقع نہیں ہے تو دولت کی حرص میں توانائیوں کا استعمال ایک ہولناک بیماری ہے، جس کا علاج ناگزیر ہے۔ دولت پرستی کا بڑھتا ہوا یہ رجحان معاشرہ میں تفریق پیدا

کرنے کا ذریعہ بنتا ہے اور خود دولت مندوں کو جسمانی اور روحانی طور پر بہت ساری بیماریوں میں مبتلا کرنے کا موجب بھی۔

ہم جس رسول کی امت ہیں، مال سے بے نیازی کے سلسلہ میں جب ہم اپنے سردار ﷺ کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں اور ان سے اپنی زندگی کا تقابل کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہماری زندگی میں اس نمونہ کا کوئی معمولی حصہ بھی موجود نہیں۔

(۹۷) قرآن میں ایسے لوگوں کی تعریف فرمائی گئی ہے، جن کو خرید وفروخت (وکاروبار) اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرتا۔

رجال لاتلهيهم تجارة ولابيع عن ذكر الله.

جن کی اللہ تعریف فرمائے، ان کی خوش نصیبی کا کیا ٹھکانہ ہے۔

مولانا تھانویؒ نے لکھا ہے کہ یہ آیت اصل ہے خلوت در انجمن کی، (یعنی مصروفیات کے باوجود متوجہ الی اللہ ہونے کی)۔

جب ذکر اس سطح پر آتا ہے کہ دل کے سارے حصے ذکر سے سرشار ہوجاتے ہیں۔ تو فرد کی یہ حالت ہوجاتی ہے، جس کا ذکر کیا گیا، جب تک طالب کی یہ حالت نہیں ہوتی، تب تک اسے ذکر وفکر کے مجاہدوں کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، اس سے پہلے اسے خطرات ہی خطرات لاحق ہوتے ہیں، خطرات اس بات کے کہ ذکر کا مزاج راسخ نہ ہونے کی وجہ سے کہیں وہ نفس پرستی کی قوتوں کی طوفانی لہروں کی نذر نہ ہوجائے، حب جاہ وحب مال کے جذبات اسے گھیر نہ لیں، کہیں وہ جھوٹ، مکر، فریب اور اشتعال جیسے گناہوں کا شکار نہ ہوجائے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کو فرد کے ذکر کی یہی سطح پسند ہے اور ذکر کے ایسے مجاہدے عزیز ہے، جس کے نتیجہ میں توجہ الی اللہ متاثر نہ ہو اور غفلت وسستی کا غلبہ نہ ہو۔

خرید وفروخت اور کاروبار، زندگی کا لازمی حصہ ہے، اس سے فرار ممکن نہیں۔ اسلام، کاروباری زندگی اختیار کرنے کی تعلیم دیتا ہے، لیکن کاروبار اسی وقت باعث خیر وبرکت بن سکتا

ہے، جب مجاہدوں کے ذریعہ ذکر کا مزاج راسخ ہونے لگتا ہے۔ ورنہ دوسری صورت میں کاروبار اور بھرپور معاشی سرگرمیاں ان ساری خرابیوں کا ذریعہ بن جاتی ہے جس کا اس وقت مظاہرہ ہورہا ہے۔

(۹۸) متوسط طالب جب یہ دیکھتا ہے کہ اسے کچھ اچھے خواب نظر آرہے ہیں۔ توجہ دینے کی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے، کچھ قبل از وقت باتیں معلوم ہونے لگی ہیں تو بعض اوقات نفس کی اکساہٹ پر وہ دعویٰ کی راہ پر گامزن ہوجاتا ہے اور دوسروں کی تربیت کا کام ہاتھ میں لے کر پیر بننے لگتا ہے۔ اور بعض پیروں سے اسے خلافت کی سند بھی مل جاتی ہے۔ یہ سب قبل از وقت ہوتا ہے اور اس میں نفس کی اکساہٹ شامل ہوتی ہے، اس طرح کے طالب بڑے خطرے سے دوچار ہوجاتے ہیں۔ وہ کشف، توجہ، اور مریدوں کے حصول کی کوششوں پر اکتفا کرکے، زندگی بھر نفس مطمئنہ کے مقام تک رسائی حاصل کرنے سے محروم ہوجاتے ہیں، یہ سزا ہوتی ہے، جو راہ سلوک میں صبر واستقامت کے ساتھ نہ چلنے اور کشف وتوجہ جیسی چیزوں کو فیصلہ کن اہمیت دینے اور دعویٰ کے نتیجہ میں ملتی ہے۔ اس طرح بہت سارے متوسط طالب نفسی قوتوں اور اس کے مکر وفریب کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ضایع ہوجاتے ہیں۔ ریاضتوں اور مشقوں سے انہیں دوسروں کو اپنی طرف راغب کرنے اور مرید بنا کر راہ سلوک میں کسی حد تک چلانے کی استعداد ضرور حاصل ہوتی ہے، لیکن ان کی اپنی اصلاح متاثر ہوتی ہے اور وہ زندگی بھر حالت خطرے میں رہتے ہیں، اس لئے ہم جیسے طالبوں کو فریب نفس سے بچنے کے لئے محتاط ہونے کی سخت ضرورت ہے اور بزرگ بن کر دوسروں کی تربیت کا کام ہاتھ میں لینے کی آرزوں اور حسرتوں سے ہر ممکن حد تک بچنا چاہئے۔ موجودہ پرفتنہ دور میں اگر فرد کی اپنی اصلاح ہوجائے تو یہ کوئی کم سعادت کی بات نہیں ہے، بلکہ سب سے بڑی سعادت ہے۔

راہ سلوک صبر، مسلسل صبر اور استقامت کی راہ ہے، اس راہ میں طویل عرصہ تک مجاہدوں سے کام لینا پڑتا ہے۔

اس راہ کی مشکلات کا اندازہ حضرت سید عبدالقادر جیلانیؒ کے ایک ہدایت نامہ سے لگایا جاسکتا ہے، جو انہوں نے اپنے ایک مرید کو خلافت دے کر ایک مقام پر دعوتی کام کرنے کے لئے رخصت کرتے وقت کی تھیں۔

ایک یہ کہ کبھی خدائی کا دعویٰ نہ کرنا، دوم یہ کہ نبوت کا دعویٰ نہ کرنا، خلیفہ حیران ہوا کہ میں برسہا برس تک آپ کی صحبت میں رہا، کیا اب بھی یہ احتمال اور خطرہ موجود ہے کہ میں خدائی اور نبوت کا دعویٰ کروں گا، آپ نے فرمایا، پہلے خدائی اور نبوت کے دعویٰ کا مطلب سمجھ لو، پھر بات کرو۔

خدا کی ذات وہ ہے کہ جو کہدے، وہ اٹل ہوتا ہے، اس میں قیل قال کی گنجائش نہیں ہوتی، جو شخص اپنی رائے کو یہ حیثیت دے اور اس درجہ میں پیش کرے کہ وہ اٹل ہے اور اس کے خلاف نہ ہوسکے تو یہ خدائی کے دعویٰ کے مترادف ہوگا۔

اور نبی وہ ہے کہ جو زبان سے فرمائے، وہ سچی بات ہے، وہ بات غلط نہیں ہوسکتی اور جو شخص اپنے قول کے بارے میں یہ کہے کہ یہ اتنی سچی بات ہے کہ اس کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا، وہ در پردہ نبوت کا مدعی ہے کہ میری بات غلط ہو ہی نہیں سکتی۔ حالانکہ یہ اس کی ذاتی رائے ہے (بکھرے موتی جلد اول صفحہ تصنیف مولانا محمد عمر صاحب پالنپوری)

راہ سلوک میں فنائے کامل سے پہلے نفس کی طرف سے اس طرح کے حربے اکثر طالب کے سامنے پیش ہوتے رہتے ہیں۔ منتہی صوفی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، تاہم اس کے غیر معمولی مجاہدوں کی برکت سے اسے فوراً انتباہ ہوتا ہے اور اس کے لئے جلد ہی سنبھلنے کی صورت پیدا ہوجاتی ہے۔

موجودہ دور میں متعدد بزرگوں کی طرف سے خلافت، حسن ظن اور دعوتی کام کے جذبہ کی بنا پر بھی دی جانے لگی ہے۔ سیرت وکردار میں پختگی نہ ہونے اور فنا کے مقام تک پوری طرح رسائی نہ ہونے کی وجہ سے یہ خلافت، طالبوں کے لئے سخت آزمائش کا سبب بن جاتی

ہے۔ ایسے طالب جن میں توجہ کی صلاحیت موجود ہے، ان کے لئے تو یہ آزمائش دوچند ہوجاتی ہے۔

چونکہ اپنے نفس کے حوالے سے اس کے تلخ تجربات ہیں، اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ یہ عرض کیا جائے کہ بزرگ بننے کی آرزوں کو پالنے سے ہر ممکن حد تک بچنا چاہئے، طالب کی سلامتی اسی میں ہے۔

اگر اللہ نے چاہا اور طالب میں استعداد دیکھی تو انشاء اللہ وہ وقت ضرور آئے گا، جب طالب پر اللہ کی شان عظمت کے نقوش غالب ہوں گے۔ اور وہ فنائیت کے مقامات طے کرکے، حالت بقا میں آئے گا اور وہ دوسروں کی اصلاح وتربیت کا ذریعہ بنے گا اور اس کی اپنی مزید روحانی ارتقا کی صورتیں بھی پیدا ہوتی جائیں گی۔

(۹۹) بزرگان دین، اللہ کی راہ میں چلنے والوں کو تین باتوں کا اطمینان دلاتے ہیں۔

(۱) جو فرد آخرت کے کاموں میں مصروف ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے دنیا کے کاموں کی ذمہ داری لیلتے ہیں۔

(۲) جو شخص اپنے باطن کو صحیح کرلے، اللہ، اس کے ظاہر کو صحیح کرلیتے ہیں۔

(یعنی باطنی اصلاح کے نتیجہ میں ظاہری اصلاح کی صورت ضرور پیدا ہوجاتی ہے)۔

(۳) جو اللہ سے اپنا معاملہ صحیح کرلیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے اور مخلوق کے درمیاں کے معاملات کو صحیح کردیتے ہیں۔

یہ تین ایسے انعامات ہیں، جو اللہ کے مخلص بندوں اور اللہ کی راہ میں استقامت سے چلنے والوں کو عطا ہوتے ہیں۔

(۱۰۰) اس نکتہ کا استحضار ہونا چاہئے کہ زندگی عبارت ہے، محبوب حقیقی کے ذکر سے، ذکر سے محرومی دل، روح، دماغ اور نفس میں تہلکہ برپا کرنے کا ذریعہ بنتی ہے، ذکر سے دوری سے دل ویران ہونے لگتا ہے اور ویران دل پر شیطان اور شیطانی قوتیں قابض ہوجاتی ہیں،

جس سے افراد کی زندگیوں اور معاشرہ میں جتنا بھی فساد برپا ہو، کم ہے، ذکر کے معمولات جاری رکھنا اور ذکر کے دورانیہ میں آہستہ آہستہ اضافہ کرتے رہنا، یہ دل روح، دماغ اور نفس کی حالت صحت اور حالت توازن کو قائم رکھنے کے لئے ناگزیر ہے۔

ذکر میں ناغہ سے بچنا چاہئے، اس لئے کہ جس دن ذکر نہ ہوگا یا برائے نام ہوگا، اس دن فرد کی شخصیت، شیطانی قوتوں اور ظلمات کی نذر ہوجاتی ہے، وہ سارا دن اشتعال، جھنجھلاہٹ، بے صبری، اعصابی تناؤ، فکری انتشار اور مادی حسن کے خیالات کے غلبہ کی حالت میں گذرنے لگتا ہے۔

جب ایک دن کے ذکر سے غفلت کی یہ سزا ملتی ہے، تو زندگی بھر ذکر سے محرومی کی جو سزا مل سکتی ہے، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

ذکر سے محرومی کے نتیجہ میں دانشوری بے معنیٰ ہوجاتی ہے، اس لئے کہ اس طرح کی دانش ذکر کے نور سے محروم ہوتی ہے، اسے دانشوری کہنا بھی بے جا ہے۔

(۱۰۱) دانش ہو یا حقیقی فہم وفراست اور تدبر، حکمت وبصیرت، ان سب کا تعلق لطیف عناصر یعنی روحانی قوتوں کی بیداری سے ہے۔ معاشرہ میں مادی عناصر کے غلبہ سے روح اور دل پر آشکار ہونے والے حقائق معدوم ہوجاتے ہیں، چونکہ حقیقی روحانیت سے عاری علوم وفنون وذہانت اپنے ساتھ ظلمات اور منفی مادی اثرات لاتے ہیں، ایسے علوم وفنوں سے بظاہر چاہے کتنی ہی ترقی ہوتی ہوئی نظر آئے، لیکن یہ علون وفنون خیر وبرکت اور سلامتی سے قاصر ہوتے ہیں، ان علوم کے حاملین حقیقی انسانیت نوازی کی صلاحیتوں سے محروم کردیئے جاتے ہیں۔ یہ علوم وفنون جتنے عام ہونے لگتے ہیں، اسی مناسبت سے معاشرہ محبت، رواداری، خیرسگالی اور حکمت وفراست سے بے بہرہ ہوکر، ترقی یافتہ جانوروں کے معاشرہ کی شکل اختیار کرنے لگتا ہے۔

آج ہم اس بات کا رونا رو رہے ہیں کہ ہمارے سیاستدانوں میں ملک کو چلانے کی

صلاحیت باقی نہ رہی ہے، ہماری انتظامیہ فہم وفراست سے عاری ہوگئی ہے، ہماری عدلیہ لوگوں کو انصاف فراہم کرنے سے قاصر ہوگئی ہے، ہمارے ڈاکٹروں میں پیچیدہ بیماریوں کی تشخیص کی صلاحیت رخصت ہوگئی ہے۔ ہمارے سارے ذہین وباصلاحیت طبقات ملی، قومی اور اجتماعی بہبود کی صلاحیتوں سے قاصر ہوگئے ہیں۔

ان ساری خرابیوں کا سب سے بنیادی سبب روح اور دل کی لطیف جوہری قوتوں پر مادی کثافتوں کے رنگ کو غالب کرنے کی کاوشیں ہیں، جو جدید مادہ پرست تعلیمی وتربیتی نظام کے ذریعہ ہورہی ہیں۔

جدید مادہ پرست اجتماعی نظام کے ہوتے ہوئے افرادقوم میں حکمت وبصیرت، حقیقی فہم وفراست، محبت ورواداری اور تحمل وبردباری جیسے اوصاف حمیدہ پیدا ہوں، یہ ممکن نہیں۔

مادہ کی کثافتوں سے مادی ''خصوصیات'' ہی ابھرتی اور طاقتور ہوتی ہیں، روح اور دل کی لطافتوں کے تربیتی نظام سے پاکیزہ سیرت وکردار اور خدا کے نور سے دیکھنے والے انسان ہی پیدا ہوتے ہیں۔

اس حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہم اپنے تعلیمی وتربیتی نظام کے ذریعہ معاشرہ کو ایسے ماہرین فراہم کررہے ہیں، جو دلِ بینا سے محروم ہیں۔ ایسا معاشرہ، جس قدر فساد سے دوچار ہو، وہ کم ہے۔ اس لئے کہ مادہ پرست تعلیم کے اثرات ایسے ہوتے ہیں، جو زندگی بھر زائل نہیں ہوتے، وہ جسم کے اعضاء کی طرح مزاج کا حصہ ہوتے ہیں۔

(۱۰۲) ذکر کے ساتھ دوسری اہم چیز جس کا ہونا ضروری ہے، وہ زندگی کے معاملات میں اسلامی شریعت کا علم ہے۔ اگر شریعت کا علم نہیں ہے تو ذکر سے فرد کو توانائی تو حاصل ہوگی لیکن شریعت جو مقصود کے درجہ میں ہے، اس سے لاعلمی یا اس پر عمل پیرا نہ ہونے کی وجہ سے فرد اللہ کے قرب سے محروم رہے گا۔ اس لئے کہ اللہ کا قرب اخلاص کے ساتھ اسلامی شریعت پر عمل پیرا ہونے سے ہی وابستہ ہے۔

سارے انبیاء کرام کا زور شریعتوں پر رہا ہے۔ اسلامی شریعت قرآن وسنت میں پوری طرح محفوظ ہے۔ اگر شریعت کے ضروری علم کے لئے فرد کے پاس وقت نہیں ہے تو علماء سے پوچھ پوچھکر ضروری شرعی علم حاصل کیا جائے، یہ انتہائی ضروری ہے۔

ذکر کا حقیقی فائدہ اسلامی شریعت کے بنیادی علم اور اس پر عمل پیرا ہونے سے ہی حاصل ہوگا، تصوف کے حلقہ میں اکثر خرابیاں جو پیدا ہوئی ہیں، وہ اسلامی شریعت کے صحیح علم نہ ہونے کی وجہ سے ہی پیدا ہوئی ہیں۔

(۱۰۳) اللہ کی ہستی، کائنات کی مرکز ہستی ہے، ساری کائنات اس کے سامنے سجدہ ریز ہے، اور اس کی تسبیح میں مصروف ہے۔

تسبح له السمٰوٰت والارض ومن فيهن وان من شيء الا يسبح بحمده ولاكن لاتفقهون تسبيحهم. (زمین وآسمان اور اس میں جو چیز بھی ہے، وہ سب اللہ کی تسبیح وتعریف بیان کررہی ہے۔ لیکن تم اس کی تسبیح کو نہیں سمجھ رہے ہو)۔

کائنات اللہ کے صفات کی مظہر ہے جب کہ ان صفات کی مظہر ہستی اللہ ہے۔ اس عظیم ہستی کے نام (اسم ذات) کی برکتیں وسعادتیں بے حد وحساب ہیں۔ وہ ہستی ایسی ہے جو انسان کی شہ رگ سے زیادہ قریب ہے۔

ونحن اقرب اليه من حبل الوريد.

وہ ہستی کائنات میں موجود سارے نور وتجلیات کی مرکز ہستی ہے۔ انسان کو یہ کتنا بڑا شرف حاصل ہے کہ اس ذات کا مستقر ومقام بندہ مؤمن کا دل ہے۔ وہ ذات، بندہ مؤمن کے دل میں ہی سما سکتی ہے۔

انسان ذات کو اتنا بڑا شرف حاصل ہونے کے باوجود یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ وہ توانائی کے دوسرے مراکز کی تلاش میں مصروف ہے۔

اتنی مقدس اور عظیم الشان ذات سے بے نیازی وغفلت کا نتیجہ ہے کہ وہ خوداعتمادی

کے ہولناک بحران میں مبتلا ہے۔اس کی شخصیت داخلی طور پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ وہ مادی حسن پر فدائیت کے ذریعہ اپنے جذبات حسن کی تسکین چاہتا ہے۔ وہ مال کی پرستش میں مبتلا ہوکر، خدائے عظیم کی تجلیات سے فیضیاب ہونے سے بے بہرہ ہو چکا ہے۔

اللہ کی ذات اور اس کے اسم ذات کے ذکر کا سہارا لئے بغیر انسان کی حالت وہی ہو سکتی ہے، جو اس غلام کی ہوجاتی ہے، جو اپنے آقا کا باغی ہوجاتا ہے۔ سنبھلنے اور بیدار ہونے کی ضرورت ہے اور اللہ کے کثرت ذکر کے ذریعہ دل کو آباد، منور اور شاداب کرکے، سارے بتوں کی نفی کی روش کو مستحکم کرنا چاہئے، یہی سعادت کی ہے۔ دنیا و آخرت کی سعادت کی راہ۔